ایمرجنسی کی آزمائشیں

اور

جماعت اسلامی ہند

انتظار نعیم

فہرست

۱۔	پیش لفظ	: انتظار نعیم	۵
مرکز، دھلی			
۲۔	جب درِ زنداں کھلا	: انتظار نعیم	۷
یو۔پی			
۳۔	داستانِ قفس	: ڈاکٹر محمد صابر علی صدیقی	۳۹
۴۔	بالا صاحب دیورس کے ساتھ	: مصطفیٰ خاں	۶۱
۵۔	لکھنؤ۔ بریلی۔ لکھنؤ	: رحمت الٰہی	۶۶
۶۔	حق گوئی و بے باکی	: محمد زین الحق	۷۰
۷۔	خطرناک قیدی	: منظور احمد خاں	۷۳
۸۔	انسان کے روپ میں دیوتا	: محمد اشرف علی قاسمی	۷۸
۹۔	سات سال کی سزا	: اکبر حسن	۸۵
۱۰۔	غیر مسلموں کی حق پرستی	: مظہر الحسن خاں	۸۷
مہاراشٹر			
۱۱۔	...للہ رب العالمین	: محمد حسین اسلمی	۸۹
۱۲۔	میدان مار لیا!	: غلام رسول دیشمکھ	۹۳
۱۳۔	قربتیں اتنی بڑھیں!	: محمد نعیم اللہ قریشی	۱۰۱
۱۴۔	وہ لذتِ نماز	: محمد سمیع	۱۰۵
۱۵۔	جماعت ملک دشمن نہیں	: ناصر اللہ خان	۱۰۸

۱۶۔ وقار بلند ہوا : سید شبیر علی ۱۱۳

مدھیہ پردیش

۱۷۔ دردِ دل اور بڑھے : انعام الرحمٰن خاں ۱۱۸

۱۸۔ ایمرجنسی کی سیاہ راتیں : محمد ظہیر عالم فلاحی ۱۳۴

۱۹۔ بنیادی حقوق غصب ہوئے : محمد محسن ۱۴۱

راجستھان

۲۰۔ آہنی سلاخوں کے پیچھے : عبدالمجید ۱۴۴

۲۱۔ ایمرجنسی کی یادیں اور آپ بیتی : محمد علی ۱۵۱

آندھرا پردیش

۲۲۔ رب کی راہ میں جیل گئے : محمد عبدالغفار ۱۵۹

۲۳۔ جرأتِ رندانہ : ابو متین ۱۶۷

کرناٹک

۲۴۔ جتنی سکت اتنی آزمائش : الطاف احمد ۱۷۱

۲۵۔ طرزِ عمل کی خوشبو بکھری : ڈاکٹر ایس احمد ۱۸۳

۲۶۔ کٹھن گھاٹیوں کا سفر : سعید احمد ۱۸۷

بہار

۲۷۔ امیر حلقہ بہار — جیل میں : محمد جعفر ۱۹۸

۲۸۔ مجرم نہیں کسی کا میں اللہ کے سوا : عبدالشکور ۲۱۴

۲۹۔ رابطے قائم رہے : عبدالرزاق شبنم ۲۲۳

ضمیمہ

۳۰۔ امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب کا مکتوب وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے نام ۲۲۵

بسمہ سبحانہ

پیش لفظ

ملک میں ۲۵/جون ۱۹۷۵ء کو وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی کانگریس گورنمنٹ کے ذریعہ ایمرجنسی کا نفاذ کیا گیا اور ۲۵ دوسری پارٹیوں کے ساتھ جماعتِ اسلامی ہند پر بھی ۴/جولائی ۱۹۷۵ء کو پابندی عاید کردی گئی، جو تقریباً دو سال کے بعد ۲۲/اپریل ۱۹۷۷ء کو بحال ہوئی۔ اس دوران میں حکومت کی جانب سے آمرانہ طرز کے جو اقدامات ہوئے اور اللہ کے فضل سے تحریک اسلامی کے افراد کو صبر و استقامت کا جو موقع ملا اس کا تقاضا ہے کہ اس کی تاریخ مرتب کر کے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دی جائے، اور دوسری وجہ جو اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کی محرک بنی وہ یہ ہے کہ:

انگریزی روز نامہ ایشین ایج (Asian Age) کے دہلی ایڈیشن کی ۱۴/فروری ۲۰۰۴ء کی اشاعت میں آر۔ایس۔ایس کے نوجوان ترجمان مسٹر رام مادھو نے کہا کہ آر۔ایس۔ایس اور جمعیۃ علماء ہند کے درمیان ایمرجنسی کے زمانہ سے ہی تعلقات ہیں نیز جمعیۃ علماء اور آر۔ایس۔ایس کے قائدین کو گرفتار کیا گیا تھا تو انہیں جیل میں ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع ملے! ایشین ایج نے لکھا کہ:

> Mr. Madhav then recalled the "bonding" between the R.S.S. and the Jamiat-Ul-Ulema-e-Hind from the days of the Emergency. "The Jamiat leaders and our leaders were all inprisoned and in jail they understood each other," Mr Madhav said.
>
> He reminded people of the days when the then R.S.S. chief, Balasaab Deoras, attended "various

functions at mosques."Mr Madhav, regretting how relations between the two communities had deteriorated, said, "Now things are improving once again."

درآں حالیکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ پابندی جمعیۃ علماء ہند پر نہیں بلکہ جماعت اسلامی ہند پر لگائی گئی اور اس کے وابستگان کو حوالۂ زنداں کیا گیا تھا اور آر۔ایس۔ایس اور جماعت اسلامی ہند کے افراد کو ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کا موقع ملا۔

اس کتاب میں جو کچھ پیش کیا جا سکا ہے وہ کسی ایک اہم قلم کار کی مسلسل تحریر نہیں ہے کہ اس میں یکساں روانی اور زبان و بیان کا نمایاں حسن ہر جگہ موجود ہو، لیکن درد وسوز اور اسیران قید و بند کے صبر و ثبات کے سلسلے میں تمام لکھنے والے احباب ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔

کتاب کے مضامین میں مختلف ریاستوں کی روداد کو ترتیب وار رکھا گیا ہے۔ جہاں تک خود راقم کی اپنی تحریر ''جب درِ زنداں کھلا'' کا تعلق ہے اس کو میں نے ایمرجنسی کے بعد ہی مرتب کرنا چاہا تھا مگر اس وقت کے نئے حالات میں بڑھی ہوئی تحریکی ذمہ داریوں میں اس کی تکمیل کا موقع نہیں مل سکا اور جو کچھ لکھا جا سکا وہ سہ روزہ 'دعوت' ہفت روزہ 'کانتی' اور ملیالم ہفت روزہ 'پریودھنم' میں شائع ہو گیا تھا۔ اب ۲۸ سال بعد اس کا بڑا حصہ کسی نوٹ یا ڈائری کے بغیر صرف یادداشت کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے، جس میں واقعات کی زمانی ترتیب کا لحاظ ممکن نہیں رکھا جا سکا ہے۔

میں اپنے ان تمام بزرگوں اور رفقا کے درجات کی بلندی کی دعا کرتا ہوں جو قید و بند کے دوران میں یا اس کے بعد اپنے رب سے جا ملے، اللہ تعالیٰ ان احباب کے صبر و ثبات کو بھی اپنی قدر دانی سے نوازے جنھیں اپنی اسیری یا آزمائش کی دوسری صورتوں میں بھی استقامت کی توفیق ملی۔ آخر میں ان تمام بزرگوں اور احباب کی شکر گزاری واجب ہے جن کی تحریروں سے الحمدللہ یہ تاریخ عزیمت و دعوت ترتیب دی جا سکی۔

دہلی، یکم جون ۲۰۰۴ء

—— انتظار نعیم

جب درِ زنداں کُھلا

□ انتظار نعیم

مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی۔ ۲۵

''کیا آپ نے راہِ حق میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور مشکلات کا خوب اچھی طرح اندازہ کرلیا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے کو پوری طرح تیار پاتے ہیں/ پاتی ہیں؟''

یہ وہ سوال ہے جس کا جواب جماعتِ اسلامی ہند کی رکنیت کے خواہش مند کسی فرد کو فارم رکنیت پُر کرتے وقت دینا ضروری ہوتا ہے۔ فارم کے اس ساتویں اور آخری سوال پر ہر اُمید وار رکنیت کا جواب اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کی بنا پر اثبات میں ہی ہوتا ہے۔

یہ سوال اسے ہمہ وقت یاد دلاتا رہتا ہے کہ جس وادی میں اس نے قدم رکھا ہے اس کے ہر مرحلے میں سخت چٹانیں ہیں، جنھیں کاٹ کر آگے قدم بڑھانا ہوتا ہے۔ میں نے بھی اس سوال کا جواب اثبات میں دیا تھا۔ اسی جواب نے اسیرانِ حق کو ایمرجنسی کی طویل سیاہ رات میں روشنی عطا کی، جرأت و حوصلہ بخشا، ثابت قدم رکھا، اور انہیں ان کی امیدوں سے کہیں زیادہ نوازا۔ اس آقا و مالک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے سخت سے سخت آزمائش میں رنج و غم اور خوف و ہراس کو ایک پل کے لیے بھی محسوس نہیں ہونے دیا۔

ہر اہل ایمان کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کا پورا پورا عزم و حوصلہ رکھے اور ہر مناسب اقدام کرے، تاہم نظم جماعت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے افراد کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے۔ چناں چہ جب ۲۶/جون ۱۹۷۵ کو

مقامی جماعت دہلی کے چند رفقا گرفتار کر لیے گئے، جن میں محترم محمد یوسف صدیقی مرحوم، محترم محمد مسلم صاحب اور محترم راؤ شمشاد علی خاں صاحب شامل تھے تو یہ جماعت کے نصب العین اور اس کے نظام تعلیم و تربیت کا فیضان تھا کہ نہ ان گرفتار شدگان کی طرف سے اور نہ دوسرے ان افراد جماعت کی طرف سے کسی کمزوری کا کوئی مظاہرہ ہوا، جن کی گرفتاری آئندہ دنوں میں یقینی معلوم ہو رہی تھی۔ گرفتاری کی خبر ملتے ہی میں فوراً مرکز جماعت پہنچ گیا اور محترم امیر جماعت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف نے دہلی کے رفقا کی گرفتاری کی بات کے ساتھ مزید بتایا کہ رام پور (یوپی) کے بھی کئی ارکانِ جماعت کی گرفتاری کی خبر موصول ہوئی ہے، آپ نے رفقاے جماعت کے صبر و استقامت کے لیے دعا فرمائی۔ مرکز کے آنگن اور مہمان خانہ میں مرکز اور شہر کے متعدد رفقاے جماعت الگ الگ حلقے بنائے ہوئے ایمرجنسی کے اچانک نفاذ، ارکانِ جماعت کی گرفتاری اور ملک میں پیدا شدہ نئی صورتِ حال پر باتیں کر رہے تھے۔

ابھی ۹ بھی نہیں بجے تھے کہ مرکز کے صحن میں دو نئے چہرے دکھائی دیے۔ ان چہروں پر وہ ''علامات'' موجود تھیں جو عام طور سے ہندوستانی پولیس کے چہروں پر ہوتی ہیں، لہٰذا سادہ لباس پہننے کے باوجود ان کو پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا۔ ان میں سے ایک نے اپنی ڈائری کھول کر امیر جماعت محترم مولانا محمد یوسف صاحب، قیم جماعت محترم جناب افضل حسین صاحب اور مولانا محترم سید حامد علی صاحب کے نام پڑھے اور مجھ سے کہا کہ ان حضرات کو ایس. ایچ. او. صاحب نے بلایا ہے۔ میں نے ان سے کہا: ''آپ لوگ جایئے، ان حضرات کو اطلاع کر دی جائے گی۔ سی آئی ڈی کے وہ دونوں آدمی اٹھ کر چلے گئے تو میں نے محترم امیر جماعت کو ان کے آنے کی اطلاع دی۔ انھوں نے کسی وارنٹ یا پولیس کے کسی ذمہ دار کی تحریر کے بغیر ہی پولیس والوں کے آنے کو ناپسند فرمایا اور مجھ کو ایس. ایچ. او. سے فون پر بات کرنے کو کہا۔

جس وقت میں نے امیر جماعت کو پولیس والوں کے آنے کی اطلاع دی تھی موصوف اپنی رہائش گاہ میں جماعت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے بعض اُن ارکان کے ساتھ

مصروف گفتگو تھے جو ایمرجنسی سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لیے مرکز آئے تھے۔

میں نے جامع مسجد پولیس چوکی کو ٹیلی فون کیا، چوکی انچارج مسٹر موجی خاں کو، سی آئی ڈی والوں کی مرکز جماعت آمد کا واقعہ سنایا تو انھوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ آپ مولانا کو زحمت نہ دیجئے بلکہ ذرا سا خود ہی پولیس چوکی تشریف لے آیئے۔

امیر جماعت کو اس کی اطلاع دے کر میں پولیس چوکی کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو موجی خاں نے سی آئی ڈی والوں کے مرکز جانے کے سلسلے میں پھر معذرت چاہی۔ وہاں معلوم ہوا کہ جماعت کے تینوں ذمہ داروں کا وارنٹ ہے، تھوڑی دیر میں گرفتاری ہوگی۔

میں نے مرکز پہنچ کر امیر محترم کو بتایا کہ پولیس جلد ہی ان حضرات کو لینے کے لیے آئے گی۔ تھوڑی دیر میں یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی کہ امیر جماعت کی گرفتاری ہو رہی ہے، لہٰذا ملاقاتیوں کا ایک تانتا بندھ گیا، لیکن پولیس اس وقت نہ آئی۔

عصر کی نماز کے بعد پولیس چوکی سے اطلاع ملی کہ صرف قیم جماعت افضل حسین صاحب کا وارنٹ ہے۔ چناں چہ چھ بجے کے قریب پولیس افسران مرکز آئے اور محترم قیم صاحب کا وارنٹ دکھایا جس پر ان کی ولدیت غلط لکھی ہوئی تھی۔ امیر جماعت نے مزاحاً فرمایا کہ شاید کسی دوسرے کا وارنٹ ہے۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد چوکی انچارج مسٹر موجی خان نے کہا کہ وہ ایس۔ڈی۔ایم سے اس کو کسی وقت ٹھیک کرا کے پھر آئیں گے۔ ہمارے کسی ساتھی نے ہنس کر کہا کہ اگر اس دوران یہ بھاگ گئے تو؟ موجی خاں نے برجستہ جواب دیا کہ ''کسی موقع پر ہم تو بھاگ سکتے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ جماعت کے لوگ نہیں بھاگیں گے۔'' لہٰذا وہ لوگ چلے گئے اور دو روز تک نہیں آئے۔

دہلی پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ شہر اپنی تمام تر ہماہمی کے باوجود شہر خموشاں لگ رہا تھا۔ ایمرجنسی کا دیو استبداد قہر برپا کر رہا تھا۔ جگہ جگہ گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب نے روزنامہ دعوت کے ذریعے سے ۲۷/

جون ۱۹۷۵ء کو رفقاے جماعت کو ہدایت دی کہ وہ صبر اور نماز سے مدد لیں اور پھر ۲۸ر جون ۱۹۷۵ء کو ایک بیان میں افراد جماعت کو مخاطب کیا کہ بہر صورت ملک میں امن وامان قائم رکھنے کی جدوجہد کی جائے۔

پولیس ۲۶ر جون ۱۹۷۵ء کی شام کو مرکز سے گئی تھی اور ۲۸ر جون ۱۹۷۵ء کی صبح لوٹی!

محترم امیر جماعت نماز ظہر سے واپس تشریف لائے تو مرکز کے تمام رفقا ان کے کمرے میں پہنچ گئے۔ میں بھی ٹیپ ریکارڈر لے کر پاس بیٹھ گیا۔ امیر جماعت نے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے ہم سب کو صبر واستقامت کی تلقین کی اور پھر سب نے دعا مانگی۔

ہم لوگ کمرے سے باہر نکلے تو دیکھا آنگن میں پولیس کی ایک بڑی فورس موجود ہے، کئی اعلیٰ افسران نے بڑھ کر انتہائی ادب سے جھک کر امیر جماعت اور قیم جماعت وغیرہ سے مصافحہ کیا۔ امیر جماعت اور مولانا سید حامد علی صاحب کو قانون فوجداری کی دفع ۱۰۸ کے تحت گرفتار کیا جارہا تھا اور قیم جماعت کو میسا (MISA) کے سیاہ قانون کے تحت۔ اتنی دیر میں مرکز میں لوگوں کا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ مرکز کے باہر سڑک پر پہنچنا شروع ہوئے۔ باہر پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں، گویا مرکز پولیس کے محاصرہ میں تھا۔ پولیس کی گاڑیاں ملاقات کرنے والوں سے گھری ہوئی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک رک گیا تھا، پڑوسی، جماعت کے ذمہ داروں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ جماعت کے ذمہ داران رکشہ میں بیٹھ کر جامع مسجد کی طرف چلے۔ ان کے ساتھ کچھ رکشے پر اور کچھ پیدل رفقاے جماعت تھے۔ ان کے پیچھے پولیس کی پیدل فورس اور اس کے پیچھے پولیس کی خالی گاڑیاں۔ مرکز سے جامع مسجد تک عجیب منظر تھا۔ سب کی صورتیں سراپا سوال تھیں:

دیوانے اِس شان سے گزرے جبر وسزا کی منزل سے
ایک زمانہ حیراں حیراں تا درِ زنداں آیا تھا

تھوڑی ہی دیر میں یہ چھوٹا سا قافلہ جامع مسجد کے چوراہے پر پولیس چوکی کے

پاس پہنچ گیا۔ ایڈیٹر ماہنامہ ''الحسنات'' جناب محمد عبدالحئی صاحب کی کار وہاں موجود تھی۔ امیر جماعت وغیرہ سب اسی میں بیٹھ گئے۔ چند لمحوں میں بھیڑ جمع ہوگئی۔ جو لوگ جماعت کے ذمہ داروں سے واقف تھے وہ حیرت اور افسوس کا اظہار کر رہے تھے اور جو نہیں پہچان پا رہے تھے وہ ان حضرات کی صورتیں دیکھ رہے تھے اور تعجب سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کون حضرات ہیں؟ پولیس نے چوکی کے نیچے شاہراہِ عام پر جماعت کے ذمہ داروں کو کافی دیر تک روکے رکھا، پھر عدالت کا رخ کیا۔

عدالت کی طرف جانے والا یہ قافلہ جو اور بڑا ہو گیا تھا کچھ دیر کے بعد ایس۔ ڈی۔ ایم کی عدالت میں پہنچا۔ قیم جماعت پر میسا (MISA) لگایا گیا تھا اس لیے ان کو باہر بیٹھے رہنے دیا گیا' عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔

ایس۔ ڈی۔ ایم جناب اے کے پینڈی کرسیِ عدالت پر تشریف لائے۔ ان کے سامنے دو ملزموں کو پیش کیا گیا کہ شاید اس سے پہلے انھوں نے ایسے ملزم دیکھے بھی نہ ہوں گے۔ حکومت کی طرف سے سب انسپکٹر مسٹر رشی پرکاش نے مجسٹریٹ کو کاغذات پیش کرتے ہوئے الزام لگایا:

''مولانا محمد یوسف اور مولانا سید حامد علی صاحب ایک میٹنگ میں یہ کہہ رہے تھے کہ اندرا گاندھی دیش میں تاناشاہی لانا چاہتی ہے اس لیے اس کا تختہ الٹ دو۔''

گویا ان پر حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام تھا۔ جن لوگوں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قانون کی پابندی میں گزر رہا ہو ان کو قانون شکنی کا مجرم گردانا جا رہا تھا! الزام سن کر کھچا کھچ بھری ہوئی عدالت مسکرا اٹھی۔

رشی پرکاش کی صورت سے شرمندگی اور ندامت ٹپک رہی تھی۔ ایس۔ ڈی۔ ایم صاحب بالکل چپ تھے مگر ان کی خاموشی گویا یہ بتا رہی تھی کہ اس الزام کی حقیقت عیاں ہے، ویسے اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے صرف اتنی بات ذہن میں تازہ کر لینی کافی ہوگی کہ جماعت کے ان تینوں رہنماؤں کو وارنٹ کی اطلاع دینے کے ۵۳ گھنٹے بعد گرفتار کیا گیا تھا!

امیر جماعت نے بڑی پروقار اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہا کہ ''یہ الزام بالکل غلط

اور بے بنیاد ہے۔'' اور شہادت میں بہت سی چیزیں تحریری شکل میں عدالت کے سامنے پیش کیں۔ جن میں اس خط کی نقل بھی تھی جس میں انھوں نے ملکی مفاد کے ایک اہم مسئلے پر حکومت کو مفید مشورے دئے تھے، اور ساتھ ہی وزیر اعظم کا وہ تحسین آمیز خط بھی پیش کیا جو جواباً موصوف کے نام تحریر کیا گیا تھا اور عدالت کو یہ بھی بتایا کہ جماعت کی طرف سے ملک کی تعمیر و ترقی اور باشندگان ملک کے درمیان بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کے سلسلے میں تسلسل کے ساتھ کیا کوششیں کی جارہی ہیں۔

امیر جماعت نے اپنے اُس خطبۂ صدارت کے کچھ اقتباسات بھی پڑھ کر سنائے جو جماعت کے آل انڈیا اجتماع منعقدہ دہلی ۱۹۷۴ء میں انھوں نے دیا تھا۔

ایس۔ ڈی۔ ایم اور عدالت میں موجود عوام سب چیزیں توجہ سے سنتے رہے اور مولانا سید حامد علی صاحب درمیان درمیان میں ایسی باتیں پیش کرتے رہے جن سے امیر جماعت کے بیان کی پوری تصدیق ہوتی تھی۔ اب عصر کا وقت ہو گیا تھا، نماز سے فراغت کے بعد پھر کارروائی شروع ہوئی۔ امیر جماعت نے پھر ایس آئی رشی پرکاش سے بحث شروع کی۔ آپ نے جو سوالات کیے ان کا ایس آئی سے کوئی جواب نہ بن پڑا البتہ وہ رک رک کر یہی کہتے رہے کہ یہ حضرات حکومت کا تختہ الٹنے کی بات کر رہے تھے۔ ایس آئی رشی پرکاش جب انتہائی پریشانی کے باجود اپنی بات پر اڑے رہے تو امیر جماعت نے غالباً اتمامِ حجت کے لیے ان سے کہا کہ تم یہ کہو کہ ''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہہ رہا ہوں۔'' ایس آئی نے اگرچہ دوبار یہ جملہ دہرایا مگر اسے کچھ بدل کر۔ تیسری بار امیر جماعت نے ڈانٹ کر اس سے کہا کہ جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح کہو۔ مجبور ہو کر اس نے امیر جماعت کا جملہ ادا کیا۔

اب مغرب کا وقت قریب تھا۔ ایس۔ ڈی۔ ایم نے امیر جماعت سے کہا کہ آپ چاہیں تو میں رات کے دس بجے تک عدالت میں بیٹھ سکتا ہوں مگر اس بیٹھنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ ان کا اشارہ تھا کہ جماعت کے ذمہ داروں کو بہر حال جیل جانا پڑے گا۔ مجسٹریٹ نے امیر محترم کی کبرسنی کا خیال کرتے ہوئے ان کو کرسی کی پیش کش کی

تا کہ وہ بیٹھ کر گفتگو کر سکیں لیکن انھوں نے یہ پیش کش قبول نہیں فرمائی۔ عدالت میں دوسری نماز ادا کی گئی۔

نماز مغرب کے بعد ایس۔ڈی۔ایم نے امیر جماعت اور مولانا حامد علی صاحب سے گزارش کی کہ ان کے چیمبر میں تشریف لائیں تو یہ حضرات وہاں چلے گئے اور بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ امیر جماعت رات کو ۸ بجے کے قریب مجسٹریٹ کے چیمبر سے باہر آئے۔ مشروط رہائی کی بات مسترد کر دی گئی اور جیل جانے کو منظور کر لیا گیا۔ اس راہِ عزیمت سے جماعت کا وقار بلند ہوا۔

ایس آئی رشی پرکاش میرے پاس آئے اور کہا کہ ''نعیم صاحب! ہم سے اندرا گاندھی جھوٹ بلوا رہی ہے اور پیٹ کے لیے ہم یہ سب کرنے پر مجبور ہیں۔''

میں نے کہا: ''تیاگی صاحب! دن بھر جھوٹ کا راستہ اختیار کر کے آپ کو راتوں کو نیند کس طرح آتی ہوگی؟ کیا آپ کا ضمیر آپ کو ملامت نہیں کرتا؟''

امیر جماعت بہت سے رفقاے جماعت دیگر ملاقاتیوں اور پولیس کے ہمراہ تیس ہزاری کورٹ سے باہر نکلے۔ وہ ہنس ہنس کر ایک ایک سے مصافحہ کر رہے تھے اور صبر واستقامت کی تلقین فرما رہے تھے۔

اس کے بعد لوگ جیل کی طرف روانہ ہوئے۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ محترم عبدالحئی صاحب کی کار میں امیر جماعت، قیم صاحب، مولانا حامد علی صاحب اور ان کے ساتھ مرکزی مجلسِ شوریٰ کے کئی ارکان تھے۔ میں اور برادرم شبیر احمد فلاحی پولیس کی گاڑی میں بیٹھے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ایس آئی مسٹر رشی تیاگی نے کہا کہ ''مولانا نے بڑی زبردست بحث کی ہے، کوئی بڑا وکیل بھی اتنی اچھی بحث کیا کرتا! لیکن رات کے دس بجے تک بھی بحث کی جاتی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔''

مسٹر تیاگی کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ عدالتی کارروائی تو محض ایک ڈرامہ تھا ان حضرات کو تو جیل جانا ہی تھا۔ باتوں ہی باتوں میں ہم لوگ سنٹرل جیل نئی دہلی کے دروازے پر تھے۔ (جو تہاڑ جیل کے نام سے مشہور ہے) تیاگی نے جیل کے آہنی دروازے

کھلوائے اور بڑے ہی ادب اور احترام کے ساتھ محترم امیر جماعت، محترم قیم جماعت جناب افضل حسین صاحب اور مولانا محترم سید حامد علی صاحب سے اندر جانے کی گزارش کی۔ ہم لوگوں نے ان حضرات کا سامان اندر پہنچایا۔

ہم لوگ پہلے ہی بغل گیر ہو چکے تھے، سلام اور دعائیں بھی ہو چکی تھیں۔ اب اشاروں سے جدا ہونے والوں کو الوداع کہا گیا۔ پھر ان کی دنیا دوسری تھی اور ہماری دنیا دوسری۔ یہ سارے واقعات جماعت پر پابندی عاید ہونے سے قبل ہی رونما ہوئے!

کئی روز بعد جب میں نے امیر جماعت کو دیکھا تو ان کو اور مولانا سید حامد علی صاحب کو تیس ہزاری کورٹ کی لاک اپ سے عدالت کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ، ہاتھ اٹھا کر لوگوں کی خیریت معلوم کرنا اور دعائیں دینے کا وہی روایتی دل کش انداز سامنے تھا۔

محترم امیر جماعت اور ان کے ساتھ دیگر افراد کی گرفتاری کی خبر جیسے ہی ادھر اُدھر پہنچی تو حکومت کے اس غلط اقدام پر نہایت تعجب کا اظہار کیا گیا مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے کئی نامور حضرات نے کہا کہ جماعت کے لوگ قابلِ رشک ہیں۔

قائدین جماعت کی گرفتاری ایک بڑے باب کا آغاز تھا۔ ملک کے بعض دوسرے مقامات پر بھی وابستگان جماعت کی کچھ گرفتاریاں ہوئیں اور مرکز جماعت میں تلاشیاں ہوتی رہیں۔ تلاشِ بسیار کے بعد پولیس کے ہاتھ سونے چاندی کے زیورات کا ایک ذخیرہ ملا تو پولیس کی مسرت کی انتہا نہ تھی۔ دوسرے روز ایک اردو اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ جماعت اسلامی ہند کے مرکز سے سونے چاندی کے چالیس لاکھ یا پچاس لاکھ روپے کے زیورات کا ذخیرہ برآمد ہوا۔ ملک بھر کے اخبارات پر سنسر عاید تھا۔ جو کچھ حکومت چاہتی تھی وہ شائع ہو سکتا تھا، کسی تردید یا وضاحت کی گنجائش نہ تھی۔ تاریخ پر محترم امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب کو عدالت میں لایا گیا تو موصوف نے مرکز جماعت سے پولیس کے ذریعہ قبضہ کیے گئے زیورات کے موضوع پر مجسٹریٹ سے بحث کی اور واضح کیا کہ سونے چاندی کے زیورات مرکز جماعت میں چلائی جانے والی بلاسودی قرض اسکیم کے

تحت عوام کی امانت ہیں۔ایک ایک زیور کا باقاعدہ اندراج رجسٹروں میں موجود ہے مگر ہوا یہ کہ یہ زیورات اور ان سے متعلق رجسٹر پوری ایمرجنسی حکومت کی تحویل میں رہے۔۴/۳ جولائی کی درمیانی شب میں حکومت کے ایک اور غیر دانش مندانہ اقدام کی اطلاع ملی کہ جماعت اور آر۔ایس۔ایس وغیرہ پر پابندی لگا دی گئی ہے۔جناب حفیظ میرٹھی نے شاید ایسے ہی موقعے کے لیے فرمایا تھا:

ہم ابھی جرم بھی سمجھ نہ سکے
فیصلہ بھی سنا گئی دنیا

اس صورت حال نے پورے ملک میں جماعت کے وابستگان اور اس کے بہی خواہوں کو ہی نہیں بلکہ واقفیت رکھنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔صحیح حالات جاننے کے لیے بہت سے احباب دہلی آتے جاتے رہے تھے۔

مرکز جماعت سے مولانا سید احمد عروج قادری صاحب، مولانا محمد شفیع مونس صاحب، جناب سید حامد حسین صاحب، جناب عبدالباری ایم۔اے صاحب، جناب مطیع الرحمٰن احقر صاحب، صاحب زادہ عبدالعظیم خان، جناب شبیر احمد فلاحی صاحب اور شہر سے جناب راؤ شمشاد علی خاں صاحب، جناب سید حسین صاحب، جناب شبیر احمد صاحب، مولانا سلمان ندوی صاحب، جناب عقیل ظفر صاحب، جناب حبیب اللہ قادری صاحب، جناب عبدالوحید خاں صاحب، جناب سید امین الحسن رضوی صاحب، جناب سید اوصاف سعید وصفی صاحب، جناب سید رؤف الحسن صاحب، یہاں تک کہ مرکز میں مہمان رفیق جناب عید محمد صاحب اور نوجوان ہمدردِ تحریک اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم مبین احمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔لوگ عدالتوں سے ہو کر گزرتے تھے لیکن انصاف کے لیے فی الواقع کوئی دروازہ کھلا ہوا نہیں تھا۔

جماعت اسلامی ہند پر پابندی جہاں تحریک کے قائدین، ارکان جماعت اور لاکھوں وابستگانِ تحریک کے لیے سخت آزمائش تھی وہیں برادران ملت اور ان کی تنظیموں اور جماعتوں کا بھی امتحان تھا کہ ایک برادر تنظیم کے ساتھ حکومت کے غیر عادلانہ اور ظالمانہ

رویہ کے وقت ان کا سلوک کیا ہوتا ہے؟ یہ کوئی شکایت نہیں، صرف اظہار واقعہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے اخبار روز نامہ الجمعیۃ نے جماعت اسلامی ہند پر پابندی کے حکومت کے فیصلے کا اپنے طویل اداریہ میں خیر مقدم کیا اور اس کے اقدام کی ستائش کی۔

جب جماعت اپنوں کی دعاؤں اور خیر خواہی کی شدت سے محتاج تھی تو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے 'فتنہ مودودیت' نامی اپنی کتاب طبع کرائی اور ان کے معتقدین نے اس کی خوب خوب اشاعت کی۔ گجراتی ترجمہ بھی بڑی محنت سے عام کیا گیا۔ لیکن وہیں بعض ذمہ دار شخصیات نے اپنا فرض ادا بھی کیا۔ چناں چہ جب حضرت شیخ الحدیث نے معروف عالم دین اور صاحب قلم، مدیر ماہنامہ برہان دہلی مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کو اپنی کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے لکھا تو موصوف نے برہان میں 'فتنہ مودودیت' پر بڑا سخت تبصرہ فرمایا اور جماعت پر پابندی کے دوران اس کی اشاعت پر انتہائی ناگواری کا اظہار کیا۔ مولانا اکبر آبادی صاحب نے 'برہان' کی جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں 'نظرات' کے تحت چار صفحہ کی تحریر کا اختتام اس طرح کیا کہ ''آج جب کہ جماعت اسلامی ممنوع ہے اس مکتوب (کتاب) کو شائع کرنا اور وہ بھی اشتعال انگیز عنوان سے بزدلی اور سخت قسم کی اخلاقی کمزوری ہے، پھر تبلیغی جماعت کا اس سے دلچسپی لینا بھی اس کے مسلک اور وقار کے خلاف ہے۔''

حالات سنگین تھے اور خراب سے خراب تر ہونے کے تمام اندیشے موجود تھے۔ ابھی میری اور جناب عبداللہ مبارک شاہ صاحب کی گرفتاری نہیں ہوئی تھی۔ مقدمات کی پیروی اور دوسرے متعلقات سے باخبری کی حسب موقع کوشش کی جارہی تھی۔

دہلی سے قریب ہی علی گڑھ میں معروف تصنیفی مرکز ادارۂ تصنیف و تالیف جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے ممتاز رکن محترم مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب کی سربراہی میں کام کر رہا تھا۔ معروف عالم دین مولانا سید جلال الدین عمری صاحب اس کے فعال ذمہ دار تھے۔ جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کی دو معروف شخصیات ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ

تھے۔ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب اس وقت اپنے وطن اعظم گڑھ میں تھے، لیکن ان تمام حضرات کو یکے بعد دیگرے بعض دیگر ارکان کے ساتھ گرفتار کر کے حوالہ زنداں کر دیا گیا۔

مرکز میں ہوئی اولین گرفتاریوں میں امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ ہی قیم جماعت (سکریٹری جنرل) محترم افضل حسین صاحب کو بھی گرفتار کیا گیا تھا لیکن ان پر میسا کا کالا قانون لگا کر انبالہ سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ تحریکی فکر کے حامل اخبارات، اردو روزنامہ/سہ روزہ دعوت کے ایڈیٹر جناب محمد مسلم صاحب، ریڈینس انگلش ویکلی کے ایڈیٹر جناب محمد یوسف صدیقی صاحب اور ہندی ہفتہ وار کانتی کے ایڈیٹر جناب کوثر یزدانی ندوی کو بھی گرفتار کیا گیا اور ان تمام اخبارات پر پابندی لگا کر ان کے دفاتر کو سیل کر دیا گیا جن پر پوری ایمرجنسی حکومت کے تالے لگے رہے۔ یوسف صدیقی صاحب اور محمد مسلم صاحب کو بھی انبالہ جیل بھیج دیا گیا۔ مشہور صحافی جناب کلدیپ نایر نانا جی، دیشمکھ، وجے کمار ملہوترا، سورج بھان، چرتی لال گویل اور مولانا امداد صابری صاحب وغیرہ بھی انہیں تحریکی قائدین کے ساتھ تاختم ایمرجنسی انبالہ جیل میں رہے اور ان میں باہم بہت ہی محبت و یگانگت کا رشتہ قائم ہوا۔ دہلی سے دور انبالہ جیل میں جماعتی ذمہ داران کی قید، ان سارے حضرات کے گھر کے افراد کے لیے قید در قید تھی، یعنی ان سے ملاقات کے لیے وہاں پہنچنا انتہائی سخت مرحلہ ہوتا تھا۔ حکومت کی مہربانی سے خاص طور پر جناب محمد مسلم صاحب کے خاندان پر جو گزری وہ ایک دردانگیز داستان ہے لیکن ان کی غیور اور صابر و شاکر اہلیہ اور حوصلہ مند بڑی صاحبزادی اسماء نے کسی کو قیامت گزرنے کی آہٹ تک نہ ہونے دی۔ اسماء کے شوہر جناب حبیب بدر صاحب نے بھی مسلم صاحب سے رشتہ و تعلق کا حق ادا کیا۔ کبھی میں خود یا مسلم صاحب کے بعض دوسرے احباب و بہی خواہ بطور خاص جناب عابدی الہ آبادی صاحب مرحوم (مدیر روزنامہ قومی جنگ رامپور) گھر پہنچ کر خیر و عافیت معلوم کرتے، ہمیشہ ہی انھوں نے صبر و شکر کا اظہار کیا۔

ایمرجنسی جاری تھی۔ پورے ملک پر خوف ناک سکوت طاری تھا جس کی بہترین

عکاسی تحریک اسلامی کے معروف شاعر جناب عزیزؔ بگھروی صاحب مرحوم کی اُسی دور کی اس غزل سے ہوتی ہے:

دستِ ہوس میں تیغِ جفا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
کیسی عبرت ناک سزا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

شہر تمنا سہا سہا، لرزاں لرزاں بزمِ خیال
سارا عالم خوف زدہ ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

صوت وصدا کے ایوانوں سے لوح وقلم کی محفل تک
سناٹا ہی سناٹا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

اس پر بھی تو سوچو یارو، اس پر بھی تو غور کرو
آج زمانہ کیوں ایسا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

گھٹ گھٹ کر مرجانا بھی تو دل والوں کی رسم نہیں
یہ جینا بھی کیا جینا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

کچھ تو بولو درد کے مارو کچھ تو جی ہلکا کر لو
ہائے یہ کیسی شرطِ وفا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

گویائی بھی قہر سراپا خاموشی بھی جُرم عزیزؔ
جینا جیسے کوئی سزا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

لیکن شاہی امام جامع مسجد دہلی محترم سید عبداللہ بخاری کے جمعہ کے خطبات اس سناٹے کو

اکثر و بیشتر توڑتے۔ موصوف نے جماعت اسلامی ہند پر سے پابندی اُٹھانے اور ایمرجنسی ختم کرنے کا بارہا مطالبہ کیا۔

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے بھی ممبئی میں منعقد اپنے ایک اجلاس میں حق کا آوازہ بلند کیا اور جماعت پر سے پابندی اُٹھانے کا مطالبہ کیا۔

ایمرجنسی کے دوران میں ہی ملک کے نامور دینی ادارے ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنا عظیم الشان جشن منعقد کیا جس میں عالم اسلام کی مشہور شخصیت شیخ الازہر (مصر) نے اپنے خطاب میں جماعت اسلامی ہند پر پابندی کا ذکر فرمایا اور اس پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا، جناب ایف اے رحمانی صاحب ایمرجنسی میں صدر جمہوریہ جناب فخر الدین علی احمد صاحب کے پرسنل سکریٹری تھے موصوف نے اپنی انگریزی کتاب My Eleven Years with Fakhruddin Ali Ahmed میں شیخ الازہر کی صدر جمہوریہ سے ملاقات اور جماعت کے موضوع پر ہونے والی گفتگو کا ذکر کیا ہے۔

رحمانی صاحب نے اپنی کتاب میں مزید تحریر کیا ہے کہ کچھ علماء صورت لوگ بھی صدر جمہوریہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے جماعت کے سلسلے میں سرگوشی کرتے!

۹ر یا ۱۰ر اکتوبر کی صبح فجر کی اذان میں اللہ اکبر کی صدا گونجی ہی تھی کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو پولیس فورس موجود تھی جس نے گزارش کے باوجود نماز ادا کرنے کا موقع نہ دیا اور پڑوس سے مرکز جماعت سے وابستہ دوسرے رکن جناب عبداللہ مبارک شاہ صاحب کو بھی گرفتار کیا اور ہم دونوں کو حوض قاضی پولیس تھانہ لے جایا گیا، جہاں ہم نے نماز فجر ادا کی۔ ظہر بعد ہم لوگوں کو تیس ہزاری کورٹ میں مسٹر پی۔ ڈی۔ جرول کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں گلی قاسم جان میں ہندوستانی دواخانہ کے پاس عوام کے سامنے یہ تقریر کر رہا تھا کہ ہم نے سب انتظام کر لیا ہے، آپ ساتھ دیجیے، اندرا گاندھی کا تختہ پلٹ دینا ہے! محسوس ہو رہا تھا کہ جرائم کی چارج شیٹ فراہم کر دی گئی تھی جس میں سے حسب منشا پولیس والے جس سے جو چاہتے جرم منسوب کر دیتے! جج نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا اور ہم نے بھی اپنی بے گناہی کی صفائی پیش کرنے کے لیے زبان

کھولنے کو بے سود سمجھ کر خاموشی کو بہتر جانا اور پولیس نے ہم کو دہلی کی سنٹرل جیل تہاڑ پہنچا دیا۔ وارڈ نمبر ۱۳ (جس کو سنگین وارڈ کہتے تھے) کی ایک بڑی بیرک میں محترم امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب اور تحریک کے دوسرے بزرگوں اور دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ بعض افراد کی شکایت پر ایک دن فجر کی اذان کے وقت ہی جیلر نے بیرک میں پہنچ کر سخت اعتراض کیا۔ دن میں مولانا محمد یوسف صاحب نے جیلر کی کارروائی کے خلاف پٹیشن تیار کرنی شروع کی، مگر اس کی خبر جیلر کو ہوگئی اور اس نے امیر جماعت کی خدمت میں حاضر ہوکر معذرت پیش کی اور کہا کہ میری صبح کی کارروائی کا آپ کوئی خیال نہ فرمائیں اور جس طرح چاہیں اذان اور نماز کا اہتمام کریں۔ چناں چہ یہ سلسلہ جاری رہا۔

جیل کی ایک خاص بات یہ محسوس ہوتی تھی کہ گرفتار شدگان اپنے معمولات حسبِ حال ٹھیک طور پر انجام دیتے تھے۔ صبح سے رات گئے تک نمازوں کا باجماعت اہتمام، درس قرآن و درس حدیث، ذاتی مطالعہ، زنداں کے غیر مسلم ساتھیوں سے ملنا جلنا اور گفتگوئیں، حالات حاضرہ پر اظہار خیال وغیرہ۔ مولانا سلمان ندوی صاحب اور مولانا سید احمد عروج قادری صاحب کے درس قرآن کی محفلیں تازگیِ ایمان کا باعث ہوتی تھیں۔ یہیں پر غور و فکر کے نتیجے میں مولانا عروج صاحب نے سورۂ یوسف کی تفسیر مرتب فرمائی۔ محترم امیر جماعت محمد یوسف صاحب کے صبر و ثبات کی کیفیت نمایاں تھی اور ایسا ہی کچھ حال الحمدللہ دوسرے افراد کا بھی تھا۔ تقریباً ۷۵ سال کے شیروانی پاجامہ اور سفید ٹوپی میں ملبوس فرشتہ صورت بزرگ امیر جماعت کو جب ہتھکڑیاں لگا کر عدالت لے جایا جاتا تو اطمینان میں کمی نہ آتی۔ ایک مرتبہ ایک پولیس مین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہتھکڑیاں ہمارے لیے ایک ''آنز'' (اعزاز) کی بات ہے۔

چند دیگر مسلمان قیدیوں کو جن کی وابستگی جماعت سے تو نہیں تھی لیکن ان کو ہمارے ساتھ کر دیا گیا تھا، امیر جماعت ان کا خصوصی خیال رکھتے۔

چاندنی چوک دہلی کے مشہور بنک ڈکیتی مقدمہ میں ماخوذ بھوپال کے ایک خوب رو جوان شہسوار خاں بھی ہمارے قریب تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے غیر مسلم دوستوں کے

ہمراہ تو تھے لیکن بنک کے مال سے ان کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ قید و بند نے ان کی زندگی کو بہت اچھی طرح متاثر کیا۔

امیر جماعت کھانے پینے کے سامان میں اپنے غیر مسلم ساتھیوں کا حصہ ضرور لگاتے۔ کبھی کبھی سیب کاٹ کر اس کی قاشیں مسکراتے ہوئے ان کو یہ کہہ کر پیش کرتے کہ یہ دیکھیے اس پر آپ کا نام لکھا ہوا ہے! آر۔ ایس۔ ایس رجن سنگھ کے ایک نمایاں فرد جناب سرور یہ صاحب جو ہمارے مطبخ کے انچارج تھے ان کا ہم سب خیال رکھتے تھے اور وہ خود بھی ہم سے پوری طرح مطمئن نظر آتے تھے۔ اردو کا دہلوی ذوق و مزاج تھا۔ امیر جماعت نے انہیں تفہیم القرآن کی جلد اول پیش کی جس کا انھیں مطالعہ کرتے ہوئے بارہا دیکھا گیا۔ ۲۵۔۳۰ افراد کے لیے چائے خود بناتے اور ایک ڈرم میں لے کر بیرک میں آواز لگاتے کہ مولانا صاحب! پہلے چائے پیجیے، پھر درس ہوگا۔

پورے ملک میں گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ دہلی میں بھی یہ رفتار کم نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن اچانک جیل انتظامیہ نے امیر جماعت سے کہا کہ اگر آپ حضرات بیرک میں ایک طرف ہو جائیں تو دوسری طرف کچھ نو گرفتار شدہ نوجوانوں کو جگہ دے دی جائے۔ امیر جماعت نے فوراً اتفاق فرمالیا اور ہم سب سمٹ سمٹا کر مختصر جگہ میں ایک طرف ہو گئے۔

تحریکی حلقے میں، میں اور برادرم شبیر احمد فلاحی صاحب سب سے کم عمر اور نوجوان تھے۔ نوجوانوں کی نو گرفتار ٹیم ہم سے جلد ہی گھل مل گئی۔ اچھے خاندان کا ایک نوجوان جس سے ہماری بہت اچھی ملاقات ہو چکی تھی، ہمارے ساتھ اس کے بڑے بھائی کا رویہ کچھ جداگانہ تھا، ایک روز نظر آیا کہ وہ اپنے سر پر رومال کی پٹی باندھے اپنے بستر پر تڑپ رہے ہیں۔ میں اور شبیر فلاحی صاحب خاموشی سے ان کے پاس پہنچے، ان سے کوئی گفتگو نہ کی، ان کے سر میں بام لگایا اور ان کا سر اور پیر دباتے رہے۔ اللہ نے رحم کیا، کچھ دیر بعد انھوں نے آنکھیں کھول دیں، ہماری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا ''آپ لوگ مہان ہیں۔''

جن سنگھ کے مقامی لیڈر مدن لال کھرانہ جی ایمرجنسی لگنے کے کئی مہینے بعد گرفتار ہو کر

ہمارے وارڈ میں آئے۔ ان کی پارٹی کے لوگوں نے رات میں ایک بیرک میں ان کو استقبالیہ دیا۔ نوجوانوں نے مداری اور جمورے کا دلچسپ ڈرامہ پیش کر کے یہ شکوہ کیا کہ کھرانہ جی کہتے ہیں کہ وہ پارٹی کی سیوا کے لیے 'انڈر گراؤنڈ' تھے۔ پارٹی کے عام کارکن تو جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور وہ انڈر گراؤنڈ کے خوبصورت نام سے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے!

برادران وطن بالخصوص آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے حضرات سے جماعت کے لوگوں نے پورے ملک کی جیلوں میں بے لوث روابط قائم کیے، اس سے پہلے ان سے ہمارا کوئی خاص ربط نہ تھا۔ ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد بھی اس تعلق کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی، لیکن افسوس کہ اُن کی ہی طرف سے سرد مہری کے مظاہرے اور بعض غیر ذمہ دارانہ بیانات نے اس خوشگوار فضا کو قائم نہیں رہنے دیا۔

آر۔ایس۔ایس کے ہندی ہفتہ وار ترجمان پانچ جنیہ کے ایڈیٹر جناب دینا ناتھ مشرا جی بھی گرفتار ہو کر آئے۔ ان کے ساتھ پہلے سے ہی ملاقات تھی۔ اپنی گرفتاری کی دلچسپ روداد بیان کرتے رہے۔

چودھری چرن سنگھ صاحب، پرکاش سنگھ بادل صاحب اور مہارانی گائتری دیوی بھی ہماری ہی جیل میں تھے۔ گائتری دیوی نے ایک تیوہار کے موقع پر پوری جیل میں مٹھائی تقسیم کی جس سے ان کی عوام دوستی کا اظہار ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب انھوں نے بنگلہ دیشی خواتین کا لباس تار تار دیکھا تو ان کو ساڑیاں فراہم کیں۔ چرن سنگھ صاحب کا گم سم اور اداس رہنے کا انداز شاید فطری تھا۔ بادل صاحب نے جیل میں بھی آفس سا سجا رکھا تھا۔ ان سے بھی تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔

جیل سے تاریخوں پر عدالت جانے کا منظر بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ عام طور پر عدالت جانے کے لیے پولیس وین لوگوں سے پوری طرح بھری ہوتی تھی اور جیل سے عدالت کے درمیان کا سفر طرح طرح کے جذباتی نعروں کے درمیان گزرتا تھا۔

دہلی کے صدر بازار کے ایک چھوٹے کاروباری عمر رسیدہ جن سنگھی بہت مضطرب

رہتے اور بچوں کی پریشانی بیان کرتے رہتے تو ان کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی جاتی۔

ایک دن عدالت میں میری پیشی کے وقت جج نے کہا کہ آپ اپنی ضمانت کیوں نہیں کرا لیتے تو میں خاموش رہا، اس کے بعد جب اگلی پیشی پر بھی جج صاحب نے یہ بات دہرائی اور ضمانت منظور کر لی تو رات کے خوف ناک سناٹے میں جیل سے تنہا اپنی رہائش گاہ بارہ دری بلیماران پہنچ گیا، البتہ اپنی یہ غزل گنگناتا رہا:

شبِ سیاہ کے دل میں اتر گئے ہم لوگ
چراغِ راہ بنے اور گزر گئے ہم لوگ

ہمیں خوشی کہ اندھیرے میں روشنی پھیلی
اُنہیں ملال کہ ناحق بکھر گئے ہم لوگ

یہ واقعہ ہے کہ ہم کو نئی حیات ملی
وہ اِس گماں میں پڑے ہیں کہ مر گئے ہم لوگ

ہمارا نام بھی لینے میں عار تھی جن کو
وہ آج ڈھونڈ رہے ہیں کدھر گئے ہم لوگ

بھنور میں دیکھ کے ہم کو ہے دم بہ خود ساحل
سفر کا وقت نہ تھا کیوں اُدھر گئے ہم لوگ

ہم اور چھوڑ دیں منزل کی جستجو، توبہ
چُبھے جو خار تو پل بھر ٹھہر گئے ہم لوگ

عطا ہوئی ہے ہمیں بھی عجیب سی فطرت
ذرا دبے تھے، زیادہ ابھر گئے ہم لوگ

لپٹ لپٹ کے بہت ہم سے روئی تنہائی
جو رات لوٹ کے مدت پہ گھر گئے ہم لوگ

نعیمؔ ٹوٹے گا اب یہ سکوت تم سے ہی
ہمارے بس میں تھا جو بھی وہ کر گئے ہم لوگ

جیل سے باہر آکر محسوس ہوا کہ اصل جیل تو یہ باہر کی دنیا بنی ہوئی ہے۔ آدمی آدمی سے خوف زدہ تھا، کسی کو کسی پر اعتماد نہیں تھا، ہر شخص دوسرے کو سی آئی ڈی محسوس کرتا تھا۔ سنجے گاندھی کی حیثیت بے تاج بادشاہ کی سی تھی۔

ہماری نگاہ میں وہ سب کام تھے جو ایمرجنسی نے پیدا کر دیے تھے۔ یعنی جیل میں محبوس اپنے احباب کے مقدمات کی پیروی، جماعت کے خلاف پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ اور جماعت کی دعوت اور پروگرام کا حسبِ موقع تعارف۔

محترم امیر جماعت نے جیل سے مسز اندرا گاندھی کو ایک طویل خط لکھا تھا جس میں جماعت کا بہترین تعارف تھا اور اس کے متعلق غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور آخر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ اس خط کو معافی نامہ نہ سمجھا جائے۔ محترم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب اور راقم الحروف نے مسز اندرا گاندھی کے قریبی و قابل اعتماد ذریعہ جناب محمد یونس خان صاحب سے ملاقات کی اور خط اُن کو پیش کر دیا لیکن ان کا عذر یہی تھا کہ میڈم ان دنوں بہت مصروف ہیں۔

ایک دن میں نے انڈین یونین مسلم لیگ کے صدر اور ایم۔ پی محترم ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب سے ملاقات کی۔ کانگریس سے دیرینہ تعلق کی بنا پر ایمرجنسی کے نفاذ کے سلسلے میں لیگ کا موقف بھی کانگریس سے الگ نہ تھا لیکن سیٹھ صاحب جماعت سے بھی تعلق

خاطر رکھنے کی بنا پر جماعت پر پابندی سے بہت مضطرب تھے اور ایک بڑا تاریخی جملہ کہا کہ ''اگر مسلم لیگ پر پابندی لگ جاتی تو مجھ کو اتنا افسوس نہ ہوتا جتنا جماعت پر پابندی سے ہوا ہے، جماعت پر اس پابندی سے ہندستان میں اسلام کا کام رک گیا۔'' انہی دنوں عرب کے معروف جریدہ 'المجتمع' نے جماعت اسلامی ہند پر پابندی اور امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف صاحب اور دیگر وابستگان جماعت کی گرفتاری کی دردانگیز رپورٹ شائع کی، بلکہ 'المجتمع' کے اس شمارہ کے ٹائٹل پر مولانا محمد یوسف صاحب کو زنداں کی سلاخوں کے پیچھے دکھایا گیا تھا۔

پہلے ہی ذکر کیا گیا ہے کہ امت مسلمہ کا انگریزی ہفتہ وار ترجمان ریڈیئنس (Radiance Weekly) بھی جماعت اسلامی پر پابندی کی زد میں آیا، سرکار نے اس پر بھی غیر منصفانہ کارروائی کرتے ہوئے پابندی لگا دی تھی۔ ایک دن اپنے علاقہ کے ایس۔ڈی۔ایم جناب سید شریف الحسن نقوی صاحب کی عدالت تیس ہزاری کورٹ میں حاضری ہوئی، ان کے چیمبر میں ریڈیئنس کا کیس پیش کرنا چاہا مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی موصوف نے بے رخی و بے اعتنائی کے ساتھ طنزیہ لہجے میں فرمایا: ''کیا حال ہے آپ کی جماعت اسلامی کا؟'' میں نے بغیر توقف کے عرض کیا: ''الحمدللہ، اللہ کا شکر ہے'' اور ان کے رویے کو دیکھتے ہوئے اپنی فائل لے کر فوراً ان کے کمرے سے باہر نکل آیا تاکہ اس شعر کا مصداق نہ ہو جائے:

کیا ملا عرض مدعا کرکے
بات بھی کھوئی التجا کرکے

انتہائی خوف و ہراس کے ماحول کے باوجود پورے ملک میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے جماعت کے تئیں عقیدت و احترام کے جذبات پیدا کر دیے تھے، جماعت کا وقار بلند ہو گیا تھا اور بعض اوقات ان کا یہ احساس بھی سامنے آیا کہ جماعت حکومت کے ظلم و ستم کا پامردی اور استقامت کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہے۔ بہت سے لوگ جماعت کے سلسلے میں اپنی محبت و ہمدردی کا اظہار کرتے اور دعائیں دیتے۔ کچھ

ایسے لوگ بھی تھے جو جماعت کی ابتلاء وآزمائش پر مسرور اور شاداں وفرحاں نظر آتے تھے۔

تحریک کے ایک بڑے بہی خواہ اور ہمدرد سید امجد علی صاحب تھے، انھوں نے جماعت پر پابندی کے بعد معروف اسلامی اسکالر اور قرآن مجید کے ہندی مترجم جناب محمد فاروق خاں صاحب کو دہلی سے علی گڑھ منتقل کر کے ان سے قرآن کے موضوع پر کچھ کام کرانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے علی گڑھ کا سفر کیا اور ان کی دہلی واپسی کے لیے گفتگو کی تاکہ وہ تحریک کا اپنا تصنیفی کام جاری رکھیں، اور وہ دہلی تشریف لائے۔ انھوں نے ایک اہم ہندی کتاب 'پرلوک کی چھایا میں' تیار کی، جسے طبع کرا کے الہ آباد کے کمبھ میلے میں مقامی نوجوانوں کی ایک متحرک ٹیم کے تعاون سے تقسیم کرایا گیا۔

اسی دوران میں راقم الحروف نے اپنے احباب مولانا محمد فاروق خان صاحب اور جناب کوثر یزدانی صاحب سے مشورہ کیا اور ''مدھر سندیش سنگم'' کی بنیاد رکھی گئی جو الحمدللہ ایک معروف ادارے کی حیثیت سے ہندی میں دعوتی کام انجام دے رہا ہے۔ اس کا ہندی ترجمۂ قرآن مجید برادران وطن میں بہت مقبول ہوتا جا رہا ہے اور اس کو انٹرنیٹ کی www.quranhindi.com کی ویب سائٹ پر دیکھا اور پڑھا جا رہا ہے۔

دہلی کے قریبی شہر میرٹھ سے جماعت کے رکن اور قافلۂ تحریک ادب اسلامی کی معروف شخصیت جناب حفیظ میرٹھی صاحب کی جیل کے اندر اپنے نغموں سے باطل سے لوہا لینے کی صدا روح کو گرماتی تھی۔ باہر آئے تو ان کی غزلوں ''زنجیریں'' اور ''وفا گزر بھی گئی تخت وتاج ٹھکرا کر'' کے پیش نظر حکمرانوں نے پھر اقدام کیا اور ان کو دوبارہ میسا کے تحت حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔ مرحوم حفیظ صاحب کی دونوں غزلیں نذر قارئین ہیں:

آباد رہیں گے ویرانے، شاداب رہیں گی زنجیریں
جب تک دیوانے زندہ ہیں پھولیں گی پھلیں گی زنجیریں

آزادی کا دروازہ بھی خود ہی کھولیں گی زنجیریں
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی جب حد سے بڑھیں گی زنجیریں

جب سب کے لب سل جائیں گے ہاتھوں سے قلم چھن جائیں گے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں

اندھوں بہروں کی نگری میں یوں کون توجہ کرتا ہے
ماحول سنے گا، دیکھے گا جس وقت بجیں گی زنجیریں

جو زنجیروں سے باہر ہیں، آزاد انہیں بھی مت سمجھو
جب ہاتھ کٹیں گے ظالم کے اس وقت کٹیں گی زنجیریں

یہ طور بھی ہیں صیادی کے، یہ ڈھنگ بھی ہیں جلادی کے
سمٹیں، سکڑیں گی زنجیریں، پھیلیں گی، بڑھیں گی زنجیریں

مجبوروں کو ترسائیں گی، یوں اور ہمیں تڑپائیں گی
زلفوں کی یاد دلائیں گی جب لہرائیں گی زنجیریں

زنجیریں تو ہٹ جائیں گی، ہاں ان کے نشاں رہ جائیں گے
میرا کیا ہے ظالم تجھ کو بدنام کریں گی زنجیریں

لے دے کے حفیظ ان سے ہی تھی اُمیدِ وفا دیوانوں کو
کیا ہوگا جب دیوانوں سے ناتہ توڑیں گی زنجیریں

✤

ٹھٹک گئی ہے ہوس مصلحت کے پاس آکر
وفا گزر بھی گئی تخت و تاج ٹھکرا کر

اِنہیں یہ طنز کے تیروں کی طرح لگتا ہے
ستم زدوں سے نہ ہنس کر مزاج پوچھا کر

نہ جانے چشمِ عنایت میں کیا نظر آیا
غریب رو دیا دامن کو اپنے پھیلا کر

مجھے یہ مشورہ خوش حال لوگ دیتے ہیں
ضمیر بیچ دے اپنا، خودی کا سودا کر

فضا پہ چھائی ہے مایوسیوں کی تاریکی
مرے یقین! مری راہ میں اُجالا کر

یہ لغزشیں ہی سنبھلنا تجھے سکھا دیں گی
قدم قدم پہ سہاروں کا منہ نہ دیکھا کر

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

حفیظؔ کو بھی ہے تائید ظلم کی تاکید
یہ لوگ شمع سے کہتے ہیں تو اندھیرا کر

ایک دن لکھنؤ پہنچا اور یہاں کے سنٹرل جیل میں محبوس احباب سے ملاقات کی جن میں مولانا عبدالغفار ندوی صاحب، جناب رحمت الٰہی صاحب اور جماعت کے معاون جناب سیتا رام دویدی صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جماعت اور تحریک ادبِ

اسلامی کی معروف شخصیت م نسیم صاحب میسا کے تحت گرفتار کیے گئے تھے۔ میں نے ان کے مکان پر ان کی اہلیہ محترمہ سے خیریت دریافت کی۔ وہ محترمہ امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب کو بار بار ہتھکڑیاں لگائے جانے کی خبر سے انتہائی مضطرب و پریشانی تھیں۔ میں نے اُن کو صبر و توکل کی تلقین کی۔

عظیم دینی درس گاہ ندوۃ العلماء میں مولانا اسحاق جلیس ندوی صاحب برسرِ کار تھے۔ ان سے ممبئی کے زمانے سے ہی تعلق تھا، ان سے ملاقات کی اور پھر ان کی معیت میں مولانا علی میاں ندوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ موصوف نے محترم امیر جماعت کی خیریت معلوم فرمائی اور تحسین بھرے لہجے میں کہا ''جماعت کے لوگ قابل رشک ہیں''۔ اس کے بعد کانپور جا کر سابق مقامی امیر حافظ رشید الحسن اور مولانا اشفاق احمد اصلاحی اور محترمہ قیصر بیگم نیازی صاحبہ سے اور اسی طرح اناؤ میں اور اس کے بعد پرتاپ گڑھ، فتح پور، الہ آباد، مرزا پور، بنارس، اعظم گڑھ، بلریا گنج میں وہاں کے احباب جماعت سے ملاقاتیں کیں اور ان کی خیریت و عافیت کے متعلق حالات معلوم کیے۔ اس کے بعد مشرقی یوپی کا رخ کیا اور گونڈہ، بلرام پور، بہرائچ، بستی، ڈمریا گنج، بڑھنی، گورکھپور، لار (دیوریا) کے احباب سے ملاقاتیں کیں۔ بہرائچ جیل میں محبوس احباب سے ملاقات کا موقع ملا تو یہ جان کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہر جگہ ہمارے احباب کا رویہ صبر و تحمل کا ہے اور ایسی کوئی شکایت سامنے نہیں آئی جیسی دوسری جماعتوں کے افراد کے متعلق سننے میں آتی رہی۔

اس دوران میں اور ایمرجنسی کے بعد بھی ملک کے دوسرے علاقوں کے احباب کے متعلق جو تفصیلات سنی گئیں وہ کچھ مختلف نہ تھیں بلکہ ہر جگہ رفقا نے استقامت کا ثبوت دیا۔

گورکھ پور میں ایک دلچسپ واقعہ سامنے آیا۔ میرے ماموں جناب انوار الحق خان صاحب جب کبھی گورکھپور آتے تو جامع مسجد سے متصل تاج ہوٹل میں قیام فرماتے۔ میں اس خیال سے کہ شاید ماموں صاحب سے ملاقات ہو سکے ہوٹل گیا، اس وقت موصوف وہاں موجود نہ تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس اس اطلاع پر کہ میں ہوٹل آیا ہوں، وہاں آئی اور ماموں صاحب کے کمرے کی تلاشی لی۔ اس وقت تک ماموں صاحب بھی آ گئے تھے۔

ماموں صاحب کے کمرے سے مبلغ ۷۲ ہزار روپے برآمد ہونے پر پولیس نے ان کو پریشان کرنے کی کوشش کی تو پولیس کو بتایا گیا کہ یہ رقم جو برآمد ہوئی ہے ابھی ابھی بنک سے لائی گئی ہے جہاں ماموں صاحب کا اکاؤنٹ تھا۔ چناں چہ پولیس والے ناکام ہوکر چلے گئے۔

الہ آباد میں میں یہ جان کر سخت حیرت میں تھا کہ یو پی کے وزیر اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا جی جو مسلمانوں کی مجلسوں میں سبحان اللہ، الحمدللہ کہتے رہنے کے لیے مشہور تھے ان کی صوبائی سرکار نے جماعت کے بعض بزرگ اور بیمار ارکان کو پیرول تک نہیں دیا اور جیل ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اعظم گڑھ جیل میں جماعت اسلامی ہند کی دو برگزیدہ شخصیات، سابق امیر جماعت مولانا محترم ابواللیث اصلاحی ندوی صاحب اور مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب بھی تھے۔ گرفتاریوں کے سلسلے تحریک کے ان قائدین کے لیے نئے نہیں تھے۔ یہ سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور اس کے بعد پھر جاری رہا اور صرف یہ دو حضرات ہی نہں بلکہ دوسرے وابستگانِ جماعت بھی حوالۂ زنداں کیے جاتے رہے ہیں۔ خاص طور پر درج ذیل مواقع پر: ۱۹۵۴ء میں پی ڈی ایکٹ کے تحت، ۱۹۶۵ء میں ہندو پاک جنگ کے دوران، ۱۹۶۷ء میں مصر کے صدر کرنل جمال عبدالناصر کے دورۂ ہند کے موقع پر، ۱۹۷۱ء میں تقسیم پاکستان کے موقع پر۔ اسی طرح جب ۱۹۹۲ میں مرکز کی نرسمہا راؤ سرکار نے بی جے پی اور وی ایچ پی کے دہشت گردوں کو ۴۵۰ سالہ تاریخی بابری مسجد کی شہادت کی کھلی چھوٹ دے دی اور پھر وی۔ ایچ۔ پی پر پابندی عائد کی گئی تو ساتھ ہی جماعت اسلامی پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت کا یہ اقدام قطعی غلط اور غیر قانونی تھا چناں چہ سپریم کورٹ کے فیصلے سے جماعت کی سرگرمیاں بحال ہوگئیں۔

اس کے بعد بہار اور بنگال جانے کا موقع ملا۔ پٹنہ میں امیر حلقہ ڈاکٹر سید جناب محمد جعفر صاحب سے رمنہ روڈ ان کی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی جن کی DIR کے تحت ضمانت ہو گئی تھی۔ ان سے بہار کے حالات پر تفصیل سے مشورہ ہوا۔ اور دربھنگہ کا سفر کر کے جناب حسنین سید صاحب سے ملاقات و گفتگو ہوئی اور تمام احباب کی خیریت معلوم کی۔ کلکتہ میں

جماعت کے ایک ہمدرد سے ملاقات ہوئی اور انھیں کے ذریعہ دوسرے احباب کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے ضلع ۲۴ پرگنہ بعد گھولنوایاڑہ جا کر مولانا محمد یعقوب گھولائی صاحب سے ملاقات کی گئی اور دوسرے مقامات کے احباب کے متعلق جو حالات انہیں معلوم تھے سنے گئے۔

دہلی میں جماعت کا مرکز بدستور پولیس کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور دفاتر سیل تھے اس لیے یہ خطرہ برابر لگا رہتا تھا کہ بند کمروں میں سیلن وغیرہ کی بنا پر تمام ریکارڈ سڑ گل کر کہیں ضائع نہ ہو جائیں۔ دفاتر کھول کر ریکارڈ کو دھوپ دکھانا ضروری تھا اس کے لیے عدالت سے اجازت حاصل کی گئی۔ دفاتر کھولے گئے تو کچھ چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی خستہ حالت میں نظر آئیں۔ جماعت اسلامی کے پانچویں کل ہند اجتماع ۱۹۷۴ء کی روداد مولانا سید حامد علی صاحب نے مرتب کی تھی اور جناب افتخار الحسن صاحب نے ایڈیٹر دعوت محترم محمد مسلم صاحب کی اہم تحریروں کا انتخاب تیار کیا تھا۔ یہ دونوں اہم چیزیں دفاتر سیل کرتے وقت پولیس کی بے احتیاطی سے ضائع ہوگئیں۔ مرکزی مکتبہ اسلامی کی کتب کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ متاثر وضائع ہو چکا تھا۔

اب وسطی ہند اور جنوبی ہند کے سفر کا موقع ملا۔ میں پہلے بھوپال پہنچا، یہاں آ کر کچھ ایسا محسوس ہوا کہ سخت خوف و ہراس کی فضا ہے۔ جماعت کے ایک بزرگ رکن جو جیل میں تھے ان کے یہاں جا کر ان کی اہلیہ محترمہ سے ان کے حالات معلوم کیے۔ یہ جان کر الحمدللہ اطمینان ہوا کہ محترمہ ماشاءاللہ بہت صابر اور باغیرت ہیں، حالات کی تنگی کے باوجود ان کی جانب سے کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کے بعد کچھ دوسرے احباب کی خیریت و عافیت کے متعلق معلومات ہوئی اور آخر میں امیر حلقہ جناب انعام الرحمان خان صاحب کے یہاں حاضر ہوا۔

محترم انعام صاحب میسا کے تحت جیل میں تھے لیکن ان کی غیر موجودگی میں الحمدللہ گھر کی فضا صبر وسکون اور شکر و توکل سے معمور تھی۔ جیل سے اپنے افراد خاندان کو جو خطوط وہ لکھتے رہے تھے ان کو جبل پور کے رفیق محمد محسن صاحب نے 'میسا کے شگوفے' کے عنوان سے

مرتب کر کے شائع کیا۔ انعام الرحمٰن خان صاحب کو بعض دوسرے رفیقوں کے ساتھ ۱۹۵۲ء میں بھی ریاستی حکومت نے گرفتار کر لیا تھا۔ قید زنداں کے دوران جو ڈائری وہ لکھتے رہے تھے اُسے مرکزی مکتبہ اسلامی نے 'زنداں کا داعی' کے نام سے شائع کیا۔ موصوف کے والد صاحب اونچے درجہ کے فارسی داں تھے۔ موصوف نے والد صاحب کے قدموں میں ہی زانوے ادب تہہ کیا تھا اور اردو کے وسیع تر مطالعے کے سبب ان کا ادبی معیار بھی قابل رشک تھا۔ یہ تصدیق شدہ بات بھی علم میں آئی کہ ان کے جیل کے ساتھی عام طور پر ان سے بہت متاثر تھے۔ مشہور سوشلسٹ لیڈر مدھولمائے خاص طور سے قابل ذکر ہیں جنھوں نے جیل سے رہائی کے بعد مختلف ریاستوں کے بعض اہم مقامات پر تحسین آمیز لفظوں میں ان کا ذکر کیا۔

بھوپال سے جے پور (راجستھان) جانے کا موقع ملا۔ امیر حلقہ مولانا مظہر الحق صاحب اور دوسرے احباب جیل میں تھے۔ البتہ رام گنج بازار کے ایک باہمت اور متحرک رفیق جناب اختر صاحب مسجد میں 'کلام نبوت' کے مطالعہ و درس کے ذریعہ شمع ہدایت روشن کیے ہوئے تھے۔

اس کے بعد کوٹا پھر ٹونک کا سفر ہوا۔ ٹونک میں مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن اور ریڈیئنس ویکلی کے مینیجنگ ڈائرکٹر اور ایڈیٹر محترم محمد یوسف صدیقی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ موصوف کچھ دنوں پہلے انبالہ جیل سے جہاں وہ میسا کے تحت محبوس تھے، خرابی صحت کی بنا پر رہا ہو کر آ چکے تھے۔ موصوف نے مرکز کے تمام احباب کی خیریت معلوم کی اور فرمایا کہ جماعت اسلامی کے مرکز کی فکر دامن گیر رہتی ہے ذرا صحت سنبھلی تو انشاء اللہ دہلی آؤں گا۔ مگر موصوف کو اس کی مہلت نہ ملی اور وہ جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس کے بعد ایک اور جگہ پر جانا ہوا اور میرے لیے یہ نیا مقام تھا۔ دو جوانوں نے مجھے ایک رفیقِ جماعت کے مکان پر پہنچایا جو ان دنوں جیل میں تھے لیکن جب ان کے اہل خانہ سے ساتھی نوجوانوں نے میرا تعارف کرایا تو رفیق موصوف کی اہلیہ خوشی سے باغ باغ ہو

گئیں اوران کی والدہ محترمہ بھی۔ چند روز کے بعد مالیر کوٹلہ جانے کا موقع ملا۔ امیر حلقہ جماعت اسلامی پنجاب جناب عبدالرؤف صاحب اور وہاں کے دوسرے احباب جیل سے رہا ہو چکے تھے۔ عبدالرؤف صاحب ماشاءاللہ صاحب خلوص و کردار تھے۔ بڑی شفقت کے ساتھ تفصیل سے حالات بتائے، معلومات کا تبادلہ ہوا، الحمد للہ ملاقاتیں باعثِ اطمینان ہوئیں۔

گجرات کے سفر میں سب سے پہلے امیر حلقہ جناب حبیب الرحمٰن صاحب جو ابھی جیل میں تھے کے یہاں ان کے اہل وعیال کی خیریت معلوم کی۔ جو دوسرے احباب شہر میں موجود تھے ان سے ملاقاتیں کیں اور حالات سے واقفیت ہوئی۔ اس کے بعد بڑودہ میں جماعت کے ہمدرد اور مسلم مجلس مشاورت کے ریاستی ذمہ دار غلام محمد میمن صاحب سے ملاقات و گفتگو ہوئی اور دوسرے احباب کی خیریت بھی معلوم ہوئی۔ موصوف نے شہر سے باہر لے جا کر اپنا نیا قائم کردہ خوب صورت تعلیمی ادارہ بھی دکھایا۔

ایک سفر میں نے آندھرا پردیش، ٹمل ناڈو، کیرلا اور کرناٹک کا کیا۔ حیدرآباد، نظام آباد، کریم نگر اور وجے واڑہ پہنچ کر رفقا کے حالات معلوم کیے۔ کریم نگر میں جماعت کا حلقہ خواتین الحمد للہ بہت وسیع تھا اور اب اس میں مزید وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ خواتین نے اپنے طور پر طے کیا کہ اِس آزمائش کی گھڑی میں جب کہ جماعت کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے، بیت المال میں اپنی اعانتوں کی رقوم دوگنی کر دی جائیں۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس ایثار و قربانی کو قبول فرمائے۔ محترم عبدالرزاق لطیفی صاحب مرحوم سابق امیر جماعت اسلامی آندھرا پردیش کا پورا گھرانا ہی تحریک سے وابستہ ہے اور پورے گھرانے ہی نے حق رفاقت ادا کیا۔

مدراس میں ٹمل ناڈو جماعت کا آفس ٹرپلی کین میں تھا۔ پورا آفس سیل نہیں تھا۔ وہیں قیام رہا اور رفقاے تحریک سے ملاقاتیں رہیں۔ امیر جماعت اسلامی ٹمل ناڈو مولانا عبدالعزیز صاحب مدراس جیل میں قید تھے۔ موصوف نے اپنی معروف کتاب 'اللہ کی نشانیاں' وہیں مرتب کی۔ جیل کی زندگی نے ہی معروف ٹمل لیڈر، اسکالر اور صحافی اڈیار

کی دنیا بدل دی اور انھوں نے دولتِ ایمان سے سرفراز ہونے کے بعد عبداللہ اڈیار کے نام سے اسلامی دنیا میں بڑا نام کمایا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، خدمت اسلام کے بڑے منصوبے کے ساتھ وہ اپنے رب سے جا ملے۔

مدراس سے کالی کٹ کا سفر بہت دلچسپ اور پرسکون تھا۔ نیا علاقہ، نئی تہذیب، نئی زبان سب کچھ میرے لیے اجنبی ہوتے ہوئے اپنے ہی سے لگتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے میری کنّو میں سلور بلس جماعت کے مقامی آفس کے لیے سفر بڑا دل کش تھا۔ آفس میں رفقائے تحریک سے ملاقات نے علاقہ و زبان کی دوریاں ختم کر دیں تھیں۔ ایمرجنسی کے اثرات کم سے کم تھے، اس کے باوجود کہ جماعت کی سرگرمیوں پر پابندی لگی ہوئی تھی۔ امیر حلقہ کیرلا مولوی کے۔ سی۔ عبداللہ صاحب گرفتار ہو کر کنّور سنٹرل جیل میں قید تھے۔ جیل میں قید تھے۔ دیگر کئی کئی مقامات پر بھی رفقا جیلوں میں تھے۔

کالی کٹ سے میں کوچین پہنچا تو اسلامک سنٹر میں تحریکی ساتھی برادرم مامّنی مولوی صاحب اور دوسرے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور حالات معلوم ہوئے۔ وہاں بھی ایمرجنسی کے اثرات میں شمال کی سی شدت نہیں تھی۔

اب کرناٹک کی جانب رخ کیا۔ جماعت اسلامی کرناٹک کے امیر محترم جناب محمد سراج الحسن صاحب (جو بعد میں امیر جماعت اسلامی ہند ہوئے) اپنے دیگر رفقا کے ساتھ بنگلور جیل میں تھے۔ مختلف شہروں میں جماعت کے ذمہ داران وارکان کی گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ ایک بہت ہی فعال و متحرک اور صالح و نیک طینت رکن جماعت جناب عبدالسلام صاحب کا بنگلور جیل ہی میں انتقال ہوا۔ ان کی موت کا تذکرہ دور دور تک سننے میں آیا۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے اور درجات بلند فرمائے۔

ایمرجنسی کا ایک اہم سفر مہاراشٹر کا ہوا۔ سب سے پہلے بھساول پہنچ کر پرانے رفیق جناب غلام رسول دیشمکھ صاحب کے یہاں حاضری ہوئی۔ کسی Undertaking کے بغیر موصوف کی رہائی ہو چکی تھی۔ وہاں سے اورنگ آباد پہنچ کر جناب مزمل خاں صاحب کے گھر قیام کیا اور ان کے سمیت دیگر دوستوں کی کیفیت معلوم کی۔ وہاں سے جالنہ پہنچا اور

تحریک کی معروف شخصیت اور ناظم علاقہ جالنہ محترم محمد عبدالقیوم صاحب سے ملاقات کر کے علاقے کے تمام احباب کی صورت حال سے واقفیت حاصل کی۔ اُن کے یہاں رمضان کی سحری اوران کا خلوص نہایت لذت بخش رہا۔

جالنہ سے میں مالیگاؤں پہنچا، وہاں کی فضا بڑی خراب تھی۔ سی۔آئی۔ڈی کے دو تین لوگ سائے کی طرح میرے ساتھ لگے رہتے تھے۔ تاہم رفقا سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ رفیق محترم عبدالجبار انصاری صاحب کی دعوتِ شوق سے جماعت کے کسی بیرونی شخص کا بچ کر نکلنا آسان نہ تھا۔ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ دوستوں نے بڑی تفصیل سے حالات معلوم کیے، جناب محمد ایوب صدیقی صاحب اس میں پیش پیش تھے۔ مختلف دوستوں سے ملاقات کے بعد ناظم علاقہ ناسک محترم مولانا عبدالرشید عثمانی صاحب کے علیل بیٹے کی عیادت کی۔

میں دعاؤں اور سلام کے درمیان مالیگاؤں سے واپسی کے لیے عشاء کے قریب بس اسٹینڈ پہنچا تو محکمہ خفیہ کا قافلہ پیچھے پیچھے تھا۔ بس میں تاخیر کے سبب میں نے ٹیکسی سے سفر کا آغاز کیا تو یہ قافلہ منتشر ہو گیا۔

رات دیر گئے ٹیکسی منماڈ شہر میں اندھیرے اور سناٹے کے بیچ داخل ہوئی تو دونوں طرف سے جھپٹتی ہوئی ٹارچ کی روشنیوں نے ٹیکسی کو روک دیا۔ مسافر سکتے میں آ گئے، لیکن مجھے بات سمجھتے ہوئے ذرا بھی دیر نہ لگی۔ ٹارچ برداروں نے ٹیکسی کے قریب آ کر تمام مسافروں کے چہروں پر روشنیوں کا رخ کر کے بڑی توجہ سے جائزہ لیا اور آخر میں ایک شخص نے ٹیکسی کے باہر سے میرے قریب آ کر کہا ''آپ باہر آ جایئے'' میں نے بلند آواز سے کہا ''کون ہیں آپ لوگ؟'' اس شخص نے کہا ہم لوکل پولیس اسٹیشن سے آئے ہیں اور SHO صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ بحث کرنا بے سود تھا!

میں ان کے ساتھ رات کے اندھیرے میں پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ مجھے ایک کمرے میں بٹھا کر پردیسی نامی کانسٹیبل دو گھنٹے تک مجھ سے تفتیشی سوالات کرتا رہا اور آخر کار خود باہر چلا گیا۔ میں قصداً ایک ضخیم ہندی کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر

بعد اندازہ ہوا کہ SHO کمرے میں داخل ہوئے۔ آدھی رات کا وقت، ایمرجنسی کا خوف ناک موسم اور پولیس اسٹیشن میں تنہائی کا عالم، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے بزرگوں اور تحریکی دوستوں کی طرح سکینت کی کیفیت طاری کردی۔ جب میں نے ان کی طرف بالکل ہی توجہ نہیں کی تو آخر کار کچھ دیر بعد انھوں نے قدرے افسرانہ یعنی متکبرانہ لہجے میں پوچھا ''آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا ''ہندی ساہتیہ کا اتہاس'' اس پہلے نفسیاتی Encounter میں میں نے اپنے آپ کو کامیاب محسوس کیا۔ وہ مجھ سے متاثر معلوم ہوئے۔ انھوں نے پھر سوال کیا ''آپ کہاں جارہے ہیں؟'' مجھ کو اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا۔ میں نے کہا ''میں آپ کو پہلے ہی صاف صاف بتادوں کہ میرا تعلق جماعت اسلامی ہند سے ہے اور میں اس کے ہیڈ کوارٹرس دہلی سے وابستہ ہوں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ حکومت نے جماعت اسلامی ہند پر پابندی لگا رکھی ہے لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ سفر کرنے کے لیے جماعت کے افراد پر کوئی پابندی نہیں ہے۔'' انھوں نے پھر کہا ''مگر آپ سفر کیوں کر رہے ہیں؟'' میں نے جواباً کہا ''میرے ایک دوست کا بچہ مالیگاؤں میں شدید بیمار ہے میں اس کو دیکھ کر آرہا ہوں۔'' حوالدار پردیسی اس بیچ پھر کمرے میں آگیا اور وہ مراٹھی میں SHO سے بار بار کہتا کہ میں حقیقت بیانی سے گریز کررہا ہوں۔ میں دونوں کی مراٹھی گفتگو پوری طرح سمجھنے کے باوجود ان کو یہ بھرپور تاثر دے رہا تھا کہ میں ان کی زبان نہیں سمجھ رہا ہوں۔ SHO نے تہدید آمیز لہجے میں کہا کہ میں ٹھیک ٹھیک بتادوں، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے بھی اُسی تیور میں جواب دیا کہ ''مجھ کو جو کہنا تھا میں کہہ چکا، اب آپ کی مرضی ہے جو مناسب سمجھیں کریں!'' SHO نے پھر کہا کہ ''ہم مالیگاؤں پولیس سے معلوم کریں گے کہ آپ وہاں کیوں گئے تھے؟'' میں نے جواب دیا کہ ''آپ ضرور معلوم کریں'' چناں چہ تھوڑی دیر میں SHO مالیگاؤں پولیس سے ٹرنک کال کے ذریعہ مراٹھی میں محو گفتگو تھے جو میں پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ رات کے مہیب سناٹے میں فون پر دوسری طرف کی بھی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ SHO نے کہا کہ ''آپ نے جس شخص کی خبر دی تھی اس کو گرفتار کرلیا گیا ہے لیکن اب کیا کیا جائے؟'' اللہ کا شکر کہ دوسری

طرف سے آواز آئی کہ ''تفصیلات لے لیجئے اور جانے دیجیے۔'' یہ سننا تھا کہ SHO کا انداز یک لخت بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ ''افسوس کہ آپ جیسے لوگوں کو پریشان کرنا پڑتا ہے۔ ہم اپنی نوکری سے مجبور ہیں۔'' میں نے ایک اور نفسیاتی وار کرتے ہوئے ان سے سوال کیا کہ ''آپ اتنی اچھی ہندی کس طرح بولتے ہیں؟'' میرا وار نشانے پر لگا۔ مسٹر ٹھاکرے کا انداز اب بالکل دوستانہ سا تھا۔ انھوں نے کہا ''میرا تعلق ناگپور سے ہے اور وہاں مراٹھی کے ساتھ ہندی کا بھی رواج ہے اس لیے میں کچھ بہتر ہندی بول لیتا ہوں۔'' پھر انھوں نے کچھ یگانگت کا ماحول پیدا کرتے ہوئے کہا ''چھوڑئے یہ سب باتیں'' یہ بتایئے دہلی کا کیا حال ہے؟'' مجھے کھل کر بولنے کا موقع مل گیا۔ میں نے کہا ''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے، اصل ایمرجنسی تو شمال میں ہے۔ اب انھوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ ''آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' میں نے کہا کہ ''تکلیف تو خیر کیا ہوتی' میری گاڑی چھوٹ گئی۔'' انھوں نے کہا کہ ''میں اسٹاف کے لوگوں کو ساتھ کر دیتا ہوں آپ کو اسٹیشن چھوڑ آئیں گے۔'' میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور تنہا ہی اسٹیشن پہنچ کر ممبئی روانہ ہو گیا۔ دیگر صوبوں کی بہ نسبت وزیر اعلیٰ مہاراشٹر مسٹر شنکر راؤ چوہان نے جماعت اور افراد جماعت پر ظلم کا قدرے تدارک کرتے ہوئے ملک میں سب سے پہلے اُن کی رہائی کی صورت پیدا کی تھی۔ بمبئی کے رفقا امیر جماعت اسلامی مہاراشٹر محترم شمس پیرزادہ صاحب، جناب ریاض احمد خاں صاحب، جناب شہاب بانکوٹی صاحب، جناب محمد جاوید اقبال صاحب کافی پہلے رہا ہو چکے تھے۔ میں نے امیر جماعت اسلامی مہاراشٹر محترم شمس پیرزادہ صاحب اور دیگر دوستوں سے ملاقات کی، اپنے گھر پہنچ کر سب سے ملا اور دہلی لوٹ آیا۔

یہاں راجدھانی میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہونے لگی تھیں۔ حزب اختلاف کے درمیان اتحاد کی کوشش جاری تھی۔ کانگریس پر ایک طرح کا خوف طاری تھا۔ مسز اندرا گاندھی نے اپنی خفیہ ایجنسیوں کی ان اطلاعات کی بنیاد پر کہ فضا پوری طرح ان کے حق میں ہے، اچانک پارلیمانی انتخابات کا اعلان کر دیا تھا۔ انتخابات ہوئے اور جب نتائج آنا

شروع ہوئے تو منظر دیکھنے کے لائق تھا۔ دور آمریت لمحوں میں ختم ہو گیا۔ جماعت کے قائدین کی رہائی ہو چکی تھی۔ محترم امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب نے فوراً مسز اندرا گاندھی کے پاس دستی خط جناب محمد احسن صاحب کے ذریعہ بھجوایا اور مطالبہ کیا کہ آپ کے پاس جماعت پر پابندی عاید کیے رہنے کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز نہیں ہے' لہٰذا پابندی لگانے والے کو اپنے ہی ہاتھوں سے جماعت پر سے پابندی ہٹانی پڑی! الحمدللہ!

مرکز جماعت میں ایک جشن کا عالم تھا۔ ہر شخص بارگاہ خداوندی میں ہدیہ تشکر پیش کر رہا تھا۔ جماعت کے رفیقوں، ہمدردوں اور بہی خواہوں کا ہجوم تھا۔ اللہ رب العالمین نے آزمائش سے جماعت کو سرخرو و کامران نکال لیا تھا۔ پوری تحریک میں جیسے نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جماعت وسیع پیمانے پر متعارف ہو چکی تھی' اس کا وقار اور بلند ہو گیا تھا۔ جماعت کے بارے میں جو غلط فہمیاں اور بدگمانیاں تھیں وہ دور ہو گئی تھیں۔ جماعت نے پورے ملک میں یوم تشکر منایا اور قافلہ تحریک اسلامی اپنے رب کی رضا کے حصول کے لیے 'ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں' کا منظر پیش کر رہا تھا۔

داستانِ قفس

ڈاکٹر محمد صابر علی صدیقی
شاہ آباد، ضلع ہردوئی (یوپی)

زندگی ہنگامہ خیزیوں سے عبارت ہے۔ سفر حیات ابتلا و آزمائش کی آماجگاہ ہے۔ راہ حق پر خطر وادیوں سے گزرتی ہے، جب کہ راہ باطل سرسبز و شاداب میدانوں، پُر فضا وادیوں اور پُر رونق شاہراہوں سے۔ راہ حق کے علم برداروں کو دار و رسن سے سابقہ پڑتا ہے جب کہ راہ باطل کے علم برداروں کو دنیوی آرام و راحت سے۔ یہ ہیں دو شاہ راہیں جن کے انتخاب میں انسان آزاد ہے۔ میں نے بھی ایک راہ کو منتخب کیا' ابتلا و دار و رسن کی راہ' پر خطر وادیوں کی راہ' چٹیل میدانوں اور بے آب و گیاہ صحراؤں کی راہ' اس یقین کے ساتھ کہ یہی کامیابی کی راہ ہے' انبیا و مجاہدین کی راہ ہے، اللہ کے برگزیدہ بندوں کی راہ ہے۔ اس راہ میں آزمائش کا آنا ناگزیر تھا۔ چناں چہ قید و بند کی صورت میں یہ سلسلہ ۶ / جولائی ۱۹۷۵ء سے شروع ہوا:

دار و رسن کی منزل تک صد حیف رسائی ہو نہ سکی
راہ وفا میں کم سے کم کچھ زخم بدن پہ کھانے دو

صبح کو مطب میں داخل ہوا، مریض موجود تھے، اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ۸:۳۰ بجے سرکل انسپکٹر صاحب مع ایک سپاہی اور ایل آئی او تشریف لائے اور یہ مژدہ سنایا کہ حکومت کو میسا (MISA) میں میری ضرورت ہے۔ مجھے ایک ہفتہ قبل ہی احساس ہو گیا تھا کہ :

حق کا دامن تھامنے والو! آئے بلا تو آنے دو
جان تو جانے ہی کے لیے ہے، جان جو جائے، جانے دو

اہلیہ اور بچے سہارنپور گئے ہوئے تھے، والد صاحب گاؤں تشریف لے گئے تھے، گھر پر صرف والدہ صاحبہ تھیں۔ ایسی حالت میں سرکل انسپکٹر مجھ کو تھانہ شاہ آباد ضلع ہردوئی لے آیا۔

تھانہ شاہ آباد میں عزیز واقارب، دوست واحباب رخصت کرنے کے لیے جمع ہو گئے۔ قرب وجوار کے دوکانداروں نے بڑی خاطر تواضع کی۔ والد صاحب بھی آ گئے۔ تقریباً بارہ بجے سرکل انسپکٹر بذریعہ بس ہردوئی لایا اور سب انسپکٹر کے ذریعہ ضلع جیل ہردوئی میں داخل کر دیا گیا۔ دن کے دو بجے تھے، مجھے بیرک نمبر ۱۱ میں پہنچایا گیا جہاں پہلے سے گیارہ سیاسی قیدی نظر بند تھے، جن میں تین کمیونسٹ مارکس وادی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور باقی آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ سے تھے۔

قید و بند کا پس منظر: مسٹر راج نرائن نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے سابقہ الیکشن منعقدہ ۱۹۷۰ء کو ہائی کورٹ الہ آباد میں چیلنج کیا تھا جس کو ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جگموہن لال سنہا نے قبول کرتے ہوئے ۱۲ر جون ۷۵ء کو مسز گاندھی کے خلاف تاریخی فیصلہ سنایا۔ ان کے الیکشن کو ناجائز قرار دیتے ہوئے ۶ سال کے لیے معطل کر دیا۔ ادھر برسر اقتدار کانگریس پارٹی میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ اُدھر مسٹر جے پرکاش نرائن کی سرکردگی میں اپوزیشن مطالبہ کر رہی تھی کہ مسز گاندھی فوراً استعفا دیں، یہاں تک کہ ایجی ٹیشن کا پورا پروگرام بن گیا۔ اقتدار کی کرسی بری طرح ڈانواڈول ہونے لگی۔ مسز گاندھی بھی استعفا دینے کے لیے تقریباً تیار ہو گئی تھیں کہ ان کے قریبی لوگوں، بنسی لال اور ڈی۔کے۔ برواوغیرہ نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، چناں چہ ۲۶ر جون ۷۵ء کو ایمرجنسی کا اعلان کر دیا گیا۔ ۴ر جولائی ۷۵ء کو ۲۶ پارٹیوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا جن میں تین نمایاں پارٹیاں آر۔ایس۔ایس، جماعت اسلامی ہند اور آنند مارگ تھیں۔ ظلم و جبر کی چکی چل پڑی، ملک میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں اور تلاشیاں شروع ہو گئیں۔ دفاتر سیل کر

دئے گئے، بے بنیاد الزامات لگائے جانے لگے، حکومت کی خفیہ مشنری حرکت میں آگئی، پورے ملک میں بے گناہ افراد حوالۂ زنداں کیے جانے لگے۔ ایسا کیوں ہوا؟ کیا واقعی ملک کو عظیم خطرہ لاحق ہو گیا تھا؟ کیا ملک کی آزادی حقیقتاً خطرے میں پڑ گئی تھی؟ ایسا کچھ نہیں تھا، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ سارا جابرانہ ڈرامہ اپنی کرسی کو بچانے کے لیے اسٹیج کیا گیا۔

بیرک میں ایک کمیونسٹ نوجوان نے میرا پرجوش خیر مقدم کیا، البتہ سنگھ اور جن سنگھ کے افراد خوش نظر نہیں آئے۔ مجبوراً ایک کونے میں ڈیرا جمانا پڑا۔ شام کو میرا کھانا عام قیدیوں کے بھنڈارے سے آیا۔ پانچ کچی روٹیاں اور ایک کٹورہ پتلی دال۔ کوئی دال کا دانہ نظر آجائے تو بڑی خوش قسمتی! خدا کا شکر ادا کیا۔

سرکل میں تین بیرکیں تھیں۔ دو میں اخلاقی قیدی بند تھے اور ایک میں سیاسی قیدی جن کی تعداد ۱۲ تھی۔ رات میں بیرک بند کر دی جاتی۔ گرمی شدید تھی اور اوپر سے مچھروں کی فوج کی یلغار۔ خدا کی پناہ! اتنے بڑے مچھر کہ دیکھ کر مکھی کا شبہ ہوتا تھا۔ پوری رات گرمی اور مچھروں کا مقابلہ کرتے گزر گئی۔ یہ تھا جیل کی زندگی کا پہلا دن۔ جن سنگھ کے ایک ایم ایل اے صاحب کے لیے خصوصی انتظام تھا۔ ایک اخلاقی قیدی انھیں پنکھا جھلنے کے لیے مقرر تھا۔

تشکر کے کلمات ہی زبان سے نکلے کہ خدا نے ہمیں اس طرح آزمائشوں میں ڈال کر مواقع دیے ہیں کہ ہم اسلامی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ان سب لوگوں کو اسلامی مساوات واخوت کا درس دیں اور افہام وتفہیم کی بات کی جائے۔

صبح ہوئی تو گرد وپیش کے حالات کا جائزہ لیا۔ جیل کی اس پہلی صبح کا آغاز بھی حسب معمول نماز فجر اور تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ڈپٹی جیلر نے یہ ''مژدہ جانفزا'' سنایا کہ تمام سیاسی قیدی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم کے مطابق بی کلاس میں رکھے جائیں گے۔ لہٰذا اخلاقی قیدیوں کو دوسرے سرکل میں منتقل کر دیا گیا اور یہ سرکل صرف سیاسی نظر بندوں کے لیے مخصوص ہو گیا۔ اس طرح اب پورے سرکل میں صرف ۱۲/افراد رہ گئے تھے۔ ۸/افراد بیرک ۱۲ میں منتقل ہو گئے جو آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ سے

متعلق تھے اور بیرک ۱۱ میں ۴؍افراد رہ گئے جن میں تین مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی سے متعلق تھے چوتھا میں جس کا تعلق جماعت اسلامی ہند سے تھا۔

دو روز جیل کی فضا میں گزر جانے کے بعد دل و دماغ اپنے گرد و پیش کے حالات سے سازگار ہو رہے تھے اور یہ تقاضہ ہونے لگا تھا کہ جیل کے ساتھیوں سے تعارف حاصل کیا جائے اور دعوتِ حق کی جانب قدم بڑھایا جائے۔ اس سمت کی پیش رفت سے یہ جان کر تو قدرے اطمینان ہوا کہ افہام و تفہیم کی راہیں کھلی ہوئی نظر آنے لگی ہیں۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور دعا بھی کی کہ خدا نے ہمیں جو یہ مواقع عطا فرمائے ہیں اور ہم پر جو ذمہ داریاں عاید کی ہیں اُن کی ادائیگی میں کسی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوں۔

بجلی کے پنکھوں کا انتظام بھی ہو گیا تھا۔ مچھر دانیاں اس سے پہلے ہی مل چکی تھیں اس لیے اب جیل کے شب و روز کچھ آرام سے گزرنے لگے تھے۔ آفات و آلام سے ہر انسان متاثر ہوتا ہے۔ خدا پرست بھی اور خدا بیزار بھی۔ دکھ کا احساس سب کو ہوتا ہے، درد کی ٹیس سب کے سینے میں اٹھتی ہے۔ تکلیف میں آہ سب کی زبان سے نکلتی ہے۔ چوٹ لگے اور تکلیف نہ ہو، زخم پہنچے اور دکھ نہ ہو، خوف ہو اور دل نہ لرزے، یہ کیسے ممکن ہے؟ چناں چہ ان تمام حالات اور احساسات کی ان منزلوں سے مجھے بھی گزرنا تھا۔ البتہ دو باتیں ایسی تھیں جن سے دل و دماغ کو اطمینان اور روح کو سکون محسوس ہوتا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ دکھ، تکلیف، اُلجھن، پریشانی اور قید و بند کی صعوبتیں وقتی اور ہنگامی ہیں۔ ان کی مدت بہت کم ہوا کرتی ہے۔ میں سوچتا تھا کہ عمر عزیز کے ۳۸؍سال آرام اور راحت میں گزار چکا ہوں۔ اتنے برسوں کی راحت اور عیش کے مقابلے میں یہ چند دنوں کی تکلیف اور مصیبت کیا اہمیت رکھتی ہے۔ کلام پاک کی تعلیمات بار بار سامنے آتی تھیں کہ ہر دکھ کے ساتھ راحت ہے اور ہر تنگی کے ساتھ خوش حالی ہے۔ خدا نے ہر چیز کی مدت اور مقدار طے کر دی ہے جس میں کسی بھی کمی وبیشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر خدا کی ذات میں انسان کا یقین پختہ ہو اور مذکورہ بالا خدائی فرمان کو اس عقیدت کی نظر سے دیکھا جائے تو یقیناً دل کو ایک بے پناہ قوت اور دماغ کو سکون میسر آتا ہے۔ طبیعت مضبوطی کے ساتھ اس حقیقت پر جم جاتی ہے جس کا

تذکرہ جگر مرحوم نے اپنے شعر میں کیا ہے:

طولِ غم حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی رات ہے جس کی سحر نہ ہو

جیل کی صعوبتوں میں ایک بات تو یہی تھی کہ یہ عارضی ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر اطمینان کی بات یہ تھی کہ مومن کے لیے ہر صورتِ حال میں خیر ہی خیر ہے، خواہ وہ تکلیف کا ماحول ہو یا راحت کی فضا۔ اللہ کے آخری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''مومن کا معاملہ عجیب وغریب ہے۔ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ اگر اسے کوئی دکھ پہنچتا ہے اور وہ صبر کرتا ہے تب اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی خوشی نصیب ہوتی ہے اور وہ شکر کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔''

خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس دولت سے نوازا اور جیل کی زندگی مکمل طور پر صبر وتحمل سے وابستہ ہوگئی۔ اب کوئی ایسی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی جو اضطراب میں اضافہ کا سبب بنتی اور اعتماد اور یقین کو متاثر کرتی۔ چناں چہ گرد وپیش کے ناموافق حالات کے باوجود دل ودماغ پر کسی طرح کی ناروا کیفیت طاری نہیں تھی۔

جیل کی زندگی بھی بڑی عجیب زندگی ہوتی ہے، جہاں آدمی تفکرات میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس زندگی میں جس کی مصروفیات بہت محدود ہوگئی تھیں مطالعہ اور آرام بس دو کام تھے۔ نماز اور کھانا تو معمول میں شامل تھے اس لیے ان کا ذکر ہی کیا البتہ کبھی کبھی اپنے کپڑے خود ہی دھونے پڑتے تھے۔

مطالعہ کا ذکر آ گیا تو جیل کی لائبریری کا تذکرہ بھی نامناسب نہ ہوگا جس کے اہتمام میں ایک اصلاحی مقصد بھی شامل ہوتا ہے۔ لائبریری میں کتابوں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ موجود تھا جس میں اخلاقی، سماجی، سیاسی، تاریخی اور دیگر تقریباً ہر طرح کی کتابیں موجود تھیں، لیکن جیل کے ذمہ داران کا سلوک کتابوں کے سلسلہ میں ذمہ دارانہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لائبریری کی کوئی کتاب مکمل نہیں تھی۔ کسی کی جلد غائب کسی کے صفحات ندارد۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ گم شدہ کتابوں کی جگہ مختلف کتابوں کے اوراق جمع کر کے ان

کتابوں کی کمی پوری کردی گئی تھی!

قیدیوں کی اخلاقی اصلاح اوران کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک ماسٹر صاحب بھی مقرر تھے تاکہ جیل کی زندگی میں قیدیوں کا اخلاق سنوارا جاسکے، ساتھ ہی ناخواندہ قیدیوں کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاسکے۔ لیکن ایسا نظر آتا تھا کہ ماسٹر صاحب قیدیوں کے ساتھ گویا خود کو بھی قیدی سمجھتے تھے اور کسی نہ کسی طرح وقت گزارتے۔

جیل میں وقت کی قلت نہیں ہوتی بلکہ وقت کا کاٹنا خود ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے، اس لیے ان اوقات کا صحیح استعمال کرنے کے لیے میں نے مطالعہ کا سہارا لیا۔ مطالعہ ایک تو کتابوں کا تھا اور دوسرا جیل اور جیل کے باسیوں کا۔ ان لوگوں میں انتظامیہ کا عملہ جن میں سپرنٹنڈنٹ، جیلر، نائب جیلر، وارڈن اور نمبر دار شامل ہوتے ہیں۔ کچھ ایسی فضا نظر آتی ہے کہ نمبر دار کی حیثیت بھی کسی جیلر سے کم نہیں ہوتی اور وہ خود بھی اپنے آپ کو جیلر سے کم نہیں سمجھتے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جیلر کو سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے اور نمبر دار کو صرف نمبر داری سے۔ دراصل کچھ پرانے قیدیوں کو نئے قیدیوں پر جیلر کی طرف سے یہ رتبہ اعزازی طور پر دیا جاتا ہے جس میں ان کے ڈنڈے کی طاقت کا بھی اثر رہتا ہے۔ ان نمبر داروں کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی خبریں جیلر تک پہنچائیں نیز افسران اور قیدیوں کے ملنے جلنے والوں کے درمیان اگر کچھ ''معاملات'' طے کرانے ہوں تو یہ خدمت بھی انجام دیں۔ ان کے ذمہ ایک خدمت اور بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی اخلاقی قیدی کام نہ کرنا چاہے اور جیل کی زندگی آرام و آسائش میں گزارنے کا خواہش مند ہو تو وہ نمبر دار کے ذریعہ ماہانہ ''نذرانہ دربار عالیہ'' میں پہنچاتا رہے۔

اخلاقی قیدیوں میں کچھ قیدی یقیناً ایسے بھی ہوتے ہوں گے جو رشوت کے جرم میں سزا بھگتنے کے لیے جیل میں آئے ہوں۔ ایسے لوگوں کو لینے اور دینے کا پورا تجربہ ہوتا ہے لیکن شومیِ قسمت انسان کو کہیں سے کہیں بھیج دیتی ہے۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے دلاور فگار نے کہا تھا۔

حاکم رشوت ستاں فکرِ گرفتاری نہ کر
جس طرح بھی ہو گروہ مجرماں سے ٹوٹ جا

میں بتاؤں تجھ کو تدبیر رہائی مجھ سے سُن
لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا

جہاں تک میرے علم میں ہے جیل کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ غیر سماجی عنصر کو عام معاشرے سے الگ رکھ کر ان کی اصلاح کی جائے تا کہ وہ شریف اور با اخلاق شہری بن کر معاشرہ کا جزو بن سکیں۔ جرائم پر بھی کنٹرول ہو سکے اور معاشرہ کی بدنظمی پر بھی۔ لیکن مشاہدات کا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہماری جیلیں اخلاقی قیدیوں کی اصلاح کی بجائے، مجرم ساز بن کر رہ گئی ہیں۔ وہ اخلاقی قیدی جو واقعتاً اخلاقی مجرم نہیں ہوتے جیل کے ماحول میں رہ کر عام طور پر وہ بھی وہاں سے جرائم کے جراثیم لے کر باہر آتے ہیں۔ مشاہدات سے ایک اور بات بھی سامنے آئی کہ جیل میں ایک خاصی بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو بے قصور ہوتے ہیں لیکن الزامات کے جھوٹے ثبوتوں یا اسی طرح کی کسی اور وجہ سے قید و بند کے مستحق قرار پا جاتے ہیں اور پھر یہ سزا ان کی نفسیات پر جس طرح اثر انداز ہوتی ہے اس کا نتیجہ جرائم کے اضافے کی صورت میں رونما ہوتا ہے کیوں کہ سزا کاٹنے کے بعد سماج ان کو قبول نہیں کرتا، ان کو گری ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اور دوسری جانب جیل کا ماحول اپنے انداز میں ان کی اچھی خاصی ''تربیت'' کر دیتا ہے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا کہ خدا نے فرصت کے جو لمحات اور دعوت کا کام کرنے کے جو موقع فراہم کئے ہیں اس کا پورا پورا اور درست استعمال کیا جانا چاہئے۔ چناں چہ میں نے اس کام کی ابتدا کچھ اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ایک جیل کے ساتھی اگنی ہوتری کو اردو پڑھانا شروع کیا جس کے دوران وحدانیت، آخرت اور اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعلق بھی گفتگو ہوتی تھی۔ آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ کے افراد اکثر اوقات پوجا پاٹھ میں مصروف رہتے تھے اس لیے ان سے دعوتی ربط قائم کرنے میں کچھ دشواری ہوتی پھر بھی حسبِ موقع فرداً فرداً یا اجتماعی طور پر گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

آر۔ ایس۔ ایس کے لوگوں میں رہ کر میں نے اس کے کارکنوں کا جس حد تک مطالعہ کیا اور جہاں تک ان کے ذہنی رجحان کا اندازہ لگایا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ لوگ اُن

خیالات کے حامل ہیں جن کو اپنا کر جرمنی کے ہٹلر نے یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ آرین (جرمنی قوم) سب قوموں میں اعلیٰ وارفع ہے، وہی صحیح النسل ہیں اور انھیں کو حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ باقی قومیں آرین کی محکومی کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ وہ خواب تھا جس کو پورا کرنے کے لیے ہٹلر نے بڑے پیمانے پر کشت وخون کی راہ اختیار کی تھی جس سے ایک ایسی تاریخ مرتب کی جسے بجا طور پر انسانیت کے نام پر ایک بدنما داغ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہٹلر کا سابقہ چوں کہ یہودی قوم سے تھا اس لیے اس نے اپنا مقصد یہی بنایا تھا کہ یہودیوں کو ختم کیا جائے تب ہی آرین قوم اپنا پورا تسلط قائم کر سکے گی۔

آر۔ایس۔ایس کے افراد بھی کچھ انھیں خیالات سے وابستہ تھے، اگر چہ ذاتی اور اجتماعی بات چیت میں کسی نے براہ راست یہ بات نہیں کہی تاہم انداز بیان اور تبادلہ خیالات کا لہجہ ان کے ذہنوں کی پوری عکاسی کرتا تھا اور خود آر۔ایس۔ایس کے گرو گولوالکر بھی یہی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ ہندو قوم ہی اس ملک میں سریشٹھ (اعلیٰ) ہے۔ دوسری بات یہ کہ وقت ضرورت ہر ایک قوم سے وقتی طور پر کسی بھی قسم کا معاہدہ کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہندو قوم کے مفاد کا تقاضا ہو ایسے غلط خیالات ظاہر ہے ہندوستان جیسے مختلف عقائد رکھنے والے جمہوری ملک کے لیے کس درجہ خطرناک ہو سکتے ہیں! اس قابل نفرت تصور کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے ان لوگوں کو حتی الامکان اسلامی تصور بنی آدم، تصورِ مساوات سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ دو افراد خاص طور پر اسلام کو سمجھنے کی طرف مائل نظر آئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر شانتی سروپ اور مسٹر چندر بھان گپتا سے قربت ہوئی اور انھوں نے قرآن حکیم کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی، چناں چہ کلام پاک کا ہندی ترجمہ منگوا کر انھیں دیا گیا۔

یوں تو ۱۲ر جون ۱۹۷۵ء سے ہندستان کا ایک خاص دور شروع ہو چکا تھا۔ ہر دن اور ہر مہینہ اپنی تاریخ مرتب کر رہا تھا لیکن جولائی کا مہینہ ایک ایسا مہینہ تھا جس کی مثال نہیں ہے۔ اس مہینہ کی اپنی اہمیت یہ ہے کہ عوام کو مختلف شہری آزادیوں سے محروم کرنے کے لیے اس کے تیس ہی دنوں میں جو آرڈیننس پاس کیے گئے ان کی تعداد ۴۸ تک پہنچ گئی۔ آرڈیننس

کچھ اس طرح جاری کیے گئے کہ جمہوریت کا دھارا تانا شاہی کی طرف بہتا چلا گیا۔ میڈیا پر مکمل سنسر نافذ کر کے اسے گویا گورنمنٹ کی ''پروپیگنڈا مشین'' بنا دیا گیا تھا۔

معلوم نہیں کہ جیلر صاحب کو ہماری اصلاح و تربیت کے سلسلہ میں حکامِ بالا کی کوئی خاص ہدایت تھی یا وہ خود ہی اپنا حاضر ذہن رکھتے تھے بہر حال ان کا رویہ مقناطیسی پہلو رکھتا تھا۔ کبھی تو وہ خوف و ہراس پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور کبھی نہایت ہمدردانہ انداز میں گفتگو کرنے لگتے۔ ہمدردانہ رویہ یہ تھا کہ ہم زندانیوں کو اس بات کے لیے آمادہ کریں کہ وہ معافی نامے لکھ کر حکومت کی غلامی قبول کرنے کو تیار ہو جائیں۔ جیل کے ایک ساتھی مسٹر بلبھ سنگھ کی والدہ موت و زندگی کی کش مکش میں مبتلا تھیں' انھوں نے اپنی والدہ سے ملاقات کرنے کی اجازت طلب کی اور ڈی ایم کو درخواست پیش کی۔ معلوم ہوا کہ اجازت صرف اسی صورت میں مل سکتی تھی کہ مسٹر سنگھ تحریری طور پر اپنی ''بداعمالیوں'' کی معافی مانگ لیں' مسٹر سنگھ کی والدہ اپنے بیٹے کی شکل دیکھنے کی حسرت میں دم توڑ گئیں مگر ان کو بیٹے کا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہوا کیونکہ مسٹر بلبھ سنگھ نے معافی مانگنے سے صاف الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔

جیلر صاحب میری دماغی اصلاح کی بھی کوشش کر رہے تھے' میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے پاس آتے ہیں اور خاص ہمدردانہ لہجہ میں جو گفتگو کرتے ہیں اس کے پس پردہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جسے کہنے میں وہ جھجک رہے ہیں، چناں چہ ایک روز اپنے ہمدردانہ لہجہ میں فرمانے لگے کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے گھر کا حال بہت برا ہے۔ آمدنی کے تمام ذرائع ختم ہو گئے ہیں، آپ کی پریکٹس بند ہے، آپ کے والد اور بیوی بچے سخت پریشانیوں سے دوچار ہیں۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ معافی نامہ داخل کر دیں، اس کے سوا جیل سے رہائی کی اور کوئی صورت نہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ میرا قصور کیا ہے جس کی معافی مانگوں اگر معافی ہی مانگنا ہے تو اپنے خدا سے کیوں نہ مانگوں جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے کہ جو لوگ آج ایوانِ حکومت میں ہیں کل بھی وہی برسر اقتدار رہیں گے' ہو سکتا ہے آج جو جیل میں ہیں وہ کل اقتدار کی کرسی پر ہوں اور صاحب اقتدار جیل میں۔

اس جواب کے بعد جیلر نے پھر کبھی مجھ سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیلر صاحب میری مذکورہ باتوں سے متاثر ہیں اور میرا وقار ان کی نظر میں ایک حد تک بلند ہوا۔

''قفس'' کی اس داستان میں میرے نزدیک ان واقعات کا تذکرہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے:

اولاً مسز گاندھی اپنے پارلیمنٹ کے انتخاب کے سلسلہ میں مسٹر راج نرائن سے مقدمہ میں شکست کھا چکی تھیں، ہائی کورٹ نے ان کے خلاف جو فیصلہ دیا تھا اس کے مطابق انھیں وزیر اعظم کے منصب سے مستعفی ہو جانا چاہیے تھا لیکن موصوفہ نے حکم امتناعی (اسٹے آرڈر) حاصل کر کے اپنی کرسی کو بچانے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں اپوزیشن وزیر اعظم سے متنفر ہو گئی کیوں کہ مسز گاندھی کا عمل ظاہر کر رہا تھا کہ وہ جمہوریت کے تقاضوں کے خلاف کرسی سے چمٹی رہنا چاہتی ہیں۔

ثانیاً ممتاز لیڈر مسٹر جے پرکاش نرائن نے مطالبہ کیا کہ مسز گاندھی کو استعفا دے دینا چاہیے، بصورت دیگر وہ ۲۸ر جون ۱۹۷۵ء کو ان کی قیام گاہ کے سامنے زبردست مظاہرہ کریں گے۔

ثالثاً وہ استعفا دینے کو تیار ہو گئی تھیں۔

اس موقع پر بنسی لال اور سنجے گاندھی نے اندرا گاندھی کا پورا ساتھ دیا۔

مسز گاندھی نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا، فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند سے ملاقات کی اور ایمرجنسی کا اعلان کرا دیا۔ اپوزیشن پارٹیوں کے تمام سرکردہ افراد گرفتار کر لیے گئے۔ جے پرکاش نرائن، اٹل بہاری باجپئی، چودھری چرن سنگھ، جیوتی بسو، مرار جی ڈیسائی، محمد یوسف (امیر جماعت اسلامی ہند) اور سبھی ممتاز رہنما جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیے گئے، حتیٰ کہ مرکزی کابینہ کے ایک اہم رکن چندر شیکھر جنھوں نے ایمرجنسی کی مخالفت کی تھی ان کو بھی یہی سزا دی گئی۔

ایمرجنسی کا نفاذ ہوتے ہی شہریوں کی آزادی ختم ہو گئی تھی۔ خوف و ہراس کا ایسا

ماحول تھا کہ برٹش جبر واستبداد کی تاریخ بھی اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی تھی۔ مسز گاندھی نے نعرہ بلند کیا تھا کہ فرد سے سماج بڑا ہے اور سماج کے لیے فرد کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھارت میں سوشلزم لانے کا دعویٰ کر رہی تھیں۔ اس سوشلزم کا جس کی ابتدا پنڈت جواہر لال نہرو نے کی تھی لیکن ان کے قدم صاف طور پر ڈکٹیٹر شپ کی طرف جاتے ہوئے محسوس کیے جا رہے تھے۔ مسز گاندھی کا یہ دعویٰ ایک ڈھونگ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ فرد سے سماج بڑا ہے جب کہ فرد سے سماج بنتا ہے، اگر فرد کو ختم کر دیا جائے تو سماج خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور جب فرد ہی آزاد نہ ہوگا تو سماج کی آزادی کا تصور بھی بے سود اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب فرد کے حقوق ختم ہو جاتے ہیں تو سماج کے حقوق بھی باقی نہیں رہتے۔ یہ مسز گاندھی کی خود اپنی تھیوری تھی جو انھوں نے اپنے مشکل وقت میں اختیار کی تھی۔

اقتدار پسند لوگ اپنی اور اپنی کرسی کی نگہبانی کے لیے طاقت کا استعمال کس کس طرح کرتے ہیں اس کا تجربہ عوام کو ایمرجنسی کے دور میں خوب ہوا۔

ممتاز شہریوں کی ایک بڑی تعداد کو جیلوں میں بند کر دینے کا مسز گاندھی کے سامنے جو مقصد بھی رہا ہو لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے جیل کی ہر صبح گویا ایک نیا پیغام لے کر نمودار ہوتی تھی۔ یہ حقیقت اور بھی روشن ہو گئی کہ تحریک اسلامی کا کام ابھی بہت محدود دائرے میں ہے اور اللہ کے بندوں کی کثیر تعداد اس دعوت سے نا آشنا ہے جو تمام بندگانِ خدا کے لیے ہے۔ صحیح معنوں میں یہ احساس اس وقت بیدار ہوا جب غیر مسلم ساتھیوں سے تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ یہ خیال سامنے آتا گیا کہ خدا نے جس خدمت کے لیے ایمان کی دولت سے نوازا ہے اس میں ہم سے مجرمانہ حد تک غفلت رہی ہے، ہو سکتا ہے اسی فرض کو یاد دلانے کے لیے اللہ نے ہمیں آزمائش سے دوچار کیا ہے۔

جیل کے مینول کی رو سے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملنے کے علاوہ دوست واحباب سے بھی ملاقات کی اجازت تھی لیکن غالباً ڈی ایم صاحب کی سخت ہدایت تھی کہ والدین اور بیوی بچوں سے ہی ملاقات کی جا سکتی ہے۔ وہ بھی ایک مہینہ میں ایک بار۔ باہر کے حالات سے واقفیت کے لیے صرف اخبارات ہی ایک ذریعہ تھا۔ لیکن یہاں اخبارات

بھی وہی مہیا کیے جاتے تھے جو قطعی طور پر سرکاری ترجمان تھے۔

ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد حکومت نے ۲۰ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا تھا۔ کانگریس اپنے اب تک کے دورِ حکومت میں تو ملک کی معاشی اور اقتصادی بدحالی کا مداوا نہ کر سکی تھی لیکن ایمرجنسی کے سایہ میں ۲۰ نکاتی پروگرام کا سہارا لے کر چند مہینوں میں سب کچھ کر گزرنے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ وہ بیس نکاتی پروگرام جو اپنے اعداد کے مطابق ۲۰ ماہ میں ہی اختتام کو پہنچ گیا۔ اس کا مختصر جائزہ اس طرح ہے:

۱۔ اشیاء ضروریہ کی قیمتوں میں کمی کے رجحان کو بنائے رکھنا اور زرعی پیداوار کو بڑھانا۔

۲۔ ضروریات زندگی کی چیزوں کے نظم کو با اثر بنانا نیز سرکاری خرچ کم کرنا۔

۳۔ زرعی زمین کی حد بندی کو لاگو کرنا۔ فاضل زمین کو تیزی سے بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم کرنا۔

۴۔ بے زمین اور سماج کے کمزور طبقوں کے لیے افتادہ زمین کی تقسیم پر مؤثر توجہ کرنا۔

ایمرجنسی لاگو ہوتے ہی گھروں، دفتروں، اسکولوں، کالجوں اور کاروباری مراکز سے پکڑ کر اور بالکل جھوٹے چارج شیٹ لگا کر لاکھوں افراد کو کسی پس وپیش کے بغیر حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔ الزامات کس طرح کے تھے اسے دو مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک صاحب جن کی عمر تقریباً ۸۵ سال، ہاتھ پیروں میں رعشہ، بینائی سے بڑی حد تک معذور، صحت عمر کے مطابق۔ ڈی آئی آر کے تحت گرفتار، ان کی چارج شیٹ عدالت کے سامنے پڑھ کر سنائی گئی، کہا گیا کہ ملزم ریل کی پٹری اکھاڑ رہا تھا۔ ڈاک خانہ، تھانہ، اسپتال اور ریلوے اسٹیشن پھونکنے کے لیے عوام کو اکسا رہا تھا۔

(۲) ایک دوسرے صاحب عمر ۶۵ سال ضعف اور بیماری کی وجہ سے عرصہ سے صاحب فراش، چلنے پھرنے سے معذور، دو آدمی اٹھا کر جیل تک لائے تھے۔ چارج شیٹ لگائی گئی کہ شارع عام پر عوام کو حکومت کے خلاف بھڑکا رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ حکومت کا

تختہ الٹ دو' ڈاک خانے' تھانے اور ریلوے اسٹیشن پھونک دو وغیرہ۔

ایمرجنسی ہندوستانی عوام کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھی۔ نہایت تلخ اور بھیانک تجربہ۔ اس تجربہ نے عوام کی زندگی کو جہنم بنا دیا تھا اور شہری آزادیوں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ ایمرجنسی کے دوران پہلی مرتبہ ان کو احساس ہوا کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے ان کی جو آزادی شروع ہوئی تھی اور جس کا پرچم پنڈت جواہر لال نہرو نے لہرایا تھا اسے ۲۶/جون ۱۹۷۵ء کو خود انہیں کی بیٹی نے گویا غلامی میں تبدیل کر دیا۔ ہندوستانی پہلے انگریز کے غلام تھے اور اب اپنے ہی ملک کی ایک خاتون کی غلامی میں جکڑے جا رہے ہیں، انھوں نے جمہوریت کو دم توڑتے اور دستور کو پامال ہوتے ہوئے دیکھا۔

اخبارات پر زبردست سنسر نافذ تھا، ہندوستان بھر میں گویا کسی کو نہیں معلوم تھا کہ دہلی پر کیا گزر رہی ہے اور دہلی والوں کو اس کا علم نہیں تھا کہ سارے ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔

مکانات کو منہدم کرنا افسروں کا ایک مشغلہ تھا۔ نسبندی کے سرٹیفکٹ کو شرافت اور نیک چلنی خیال کیا جا رہا تھا۔ فضا پر خوف و ہراس طاری رہتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے بات چیت تک کرنے میں احتیاط برتتے تھے۔ وہ تمام لیڈر جو ایمرجنسی کے حق میں نہیں تھے جن کی گرفتاری پیش نظر مقصد کے لیے ضروری خیال کی گئی تھی جیلوں میں بند تھے۔

افسر شاہی اور تاناشاہی کا یہ عالم تھا کہ خود حکومت کے افسران بھی خواہ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا ایک گھٹن میں مبتلا رہتے تھے۔

میسا کا غلط اور بے جواز استعمال کیا گیا، جو ۹ برس کے بچوں سے لے کر ۹۵ برس تک کی عمر والوں پر بے تکلف استعمال کیا گیا اور انہیں ایک طویل مدت تک جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے رکھا گیا۔ ''میسا'' کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ یہ قانون منافع خوروں' اسمگلروں' مفسدوں' غنڈوں وغیرہ کے لیے اپنایا جا رہا ہے۔ سیاسی اور عوامی لیڈر اس سے مستثنیٰ رہیں گے لیکن کسی تکلف کے بغیر اس کا استعمال سیاسی اور عوامی لیڈروں پر کیا گیا اور اس پارٹی کی حکومت نے کیا جو حکومت برطانیہ کی PDA کے

سلسلہ میں سخت مذمت کرتی تھی اور یہ دعویٰ کرتی آرہی تھی کہ آزادی کے بعد اس طرح کے تمام قوانین دریابرد کردیے جائیں گے۔

اگست سے پارلیمنٹ کا گرمائی سیشن شروع ہوگیا۔ جاری شدہ آرڈیننسوں کو پاس کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ چوں کہ برسراقتدار پارٹی اکثریت میں تھی اور اپوزیشن جیلوں میں اس لیے پاس کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ دستور ہند میں ترمیم سے متعلق بل بھی پیش ہوگیا۔ ایمرجنسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترمیم و تنسیخ کرنا اور دستور کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانا کچھ مشکل نہ تھا، جمہوریت کے نام پر تاناشاہی لانا آسان ہوگیا تھا۔

۷/ستمبر ۷۵ء رمضان المبارک کا پہلا دن تھا۔ سیاسی نظر بندوں میں میں تنہا مسلمان تھا، لہٰذا افطار، تراویح و تہجد کا اہتمام تنہا ہی کرنا پڑا۔ کھانا بنانے کے لیے بھنڈاری کا دن میں ہی جیل کی طرف سے انتظام تھا چناں چہ افطار و کھانے کا انتظام بھنڈاری کردیتا تھا البتہ سحری کے لیے سپرنٹنڈنٹ جیل نے انگیٹھی اور کوئلہ کا بندوبست کرادیا چناں چہ سحری خود ہی تیار کرلیتا تھا۔ زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ ماہ مبارک کا استقبال تنہا ہی کیا۔

۷/اکتوبر ۷۵ء کو تیسویں روزہ کو جیلر صاحب نے خبر دی کہ کل چاند دیکھا جا چکا ہے اور تصدیق بھی ہوگئی لہٰذا میں نے روزہ افطار کرلیا اور قیدی کی عید ہوگئی۔

۱۴/دسمبر عید الاضحیٰ کا دن تھا۔ جیل انتظامیہ کی طرف سے اخلاقی قیدیوں کے ساتھ نماز عید ادا کرنے کی اجازت مل گئی، چناں چہ نماز کی امامت میں نے کی، اس طرح قید و بند کی زندگی میں پہلی بار عام قیدیوں سے مختصر ملاقات کا موقع ملا۔

۲۰/دسمبر کو ایک نمبردار پرچہ لے کر آیا کہ تربھون ناتھ مہروترا، رام اوتار ورما، بھکت جی اور چار افراد کا ٹرانسفر کسی دوسری جیل میں ہوگیا ہے چناں چہ سفر کی تیاری شروع کردی اور دس بجے کے قریب ڈسٹرکٹ جیل ہردوئی کے باہر آگئے۔ ایک سب انسپکٹر، دو بندوق بردار سپاہی اور سادے لباس سپاہیوں کی کسٹڈی میں الٰہ آباد بریلی پسنجر کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ بریلی سنٹرل جیل جانا ہے۔ سفر آرام سے طے ہوگیا۔

تقریباً ۹ بجے شب بریلی جیل پہنچے۔ پولیس نے جیل اسٹاف کے حوالے کر دیا۔ تلاشی لی گئی اور تنہائی میں بھیج دیا گیا۔ مختصر سی کوٹھری جس میں رفع حاجت کے لیے دو پیالے رکھے ہوئے تھے، انتہائی گندے، روشنی کا کوئی انتظام نہیں، دو پرانے کمبل لا کر دے دئے گئے۔ اللہ کا نام لے کر انھیں پر لیٹ گئے۔

صبح کمرے کی گندگی دیکھ کر طبیعت مالش کرنے لگی، فوراً سامان لے کر باہر آ گئے۔ معلوم ہوا کہ ان کوٹھریوں میں پھانسی کے قیدی رکھے جاتے ہیں۔ اتفاق سے ایک وارڈر شاہ آباد کے تقی خاں ڈیوٹی پر تھے۔ بڑی محبت سے چائے پلائی۔ تقریباً ۹ بجے صبح ملاحظہ وغیرہ رسمی کاموں سے گزر کر سرکل ۴ کی بیرک ۳ میں پہنچا دیا گیا جہاں پہلے سے مقیم سیاسی نظر بندوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ گویا اپنے خاندان میں آ گئے۔ سنٹرل جیل میں سرکل ۴ اور نہرو بیرک میں سیاسی قیدی تھے جن کی تعداد ۱۳۵ تھی جو تقریباً یوپی کے ۲۶/ اضلاع سے متعلق تھے۔

سرکل ۴ میں مشترکہ نظم تھا جو بے مثال تھا۔ سب لوگ ایک ہی پلیٹ میں کھاتے تھے اور تقسیم کار کے اصول پر عمل پیرا تھے، بالکل اسی طرح کہ سب ایک خاندان کے افراد ہیں۔ آپس میں محبت اور ہمدردی کا سلوک کرتے گو کہ مختلف پارٹیوں اور مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے تھے (یہاں میرے پہنچنے سے پہلے دو مسلمان اور تھے جن کا تعلق کسی پارٹی سے نہیں تھا۔ ایک ٹمپو ڈرائیور اور دوسرے دوکاندار تھے لیکن ایمرجنسی کا شکار ہو گئے، معلوم کیا کہ کس جرم میں آئے؟ بتایا معلوم نہیں، ہمیں تو جماعت اسلامی کا بتا کر گرفتار کر لیا۔ ہم لوگ جماعت اسلامی سے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ میں نے ان سے کہا اب جب کہ جیل میں آ گئے ہیں تو جماعت اسلامی کے بارے میں ضرور معلوم کیجئے۔ میں نے جماعت کا تفصیلی تعارف کرایا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ سے رشتہ مضبوط کرنے کی تلقین کی اور نماز کے لیے آمادہ کیا۔ لہٰذا ان کو نماز کا طریقہ سورتیں اور دعائیں یاد کرانا شروع کیا۔)

وہاں پر تعصب اور چھوت چھات نظر نہیں آئی۔ خیال ہوا کہ یہ فضا مشترکہ مصیبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، احساس بیدار ہوا کہ کاش موجودہ آزمائش کے بعد بھی یہی

کیفیت قائم رہے۔

آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے افراد کی تعداد زیادہ تھی، علاوہ ازیں آنند مارگ، کمیونسٹ مارکس وادی، بھودان تحریک اور جے گرودیو پارٹی کے افراد تھے۔ محبت و ہمدردی کی اس فضا نے یہ سنہرا موقع فراہم کیا کہ ان لوگوں سے روابط قائم کر کے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کی غلط فہمیاں دور کی جائیں اور اپنے قول و عمل سے دعوت حق کا تعارف کرایا جائے۔

رفیقانِ زنداں تحریک اسلامی کے سلسلہ میں معلومات کرنا چاہتے تھے، مختلف قسم کے سوالات کرتے تھے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا کہ اس نے اپنے خاص فضل سے اپنے دین کو بندوں تک پہنچانے کا موقع فراہم کیا۔ گویا ایمرجنسی کے شر سے پیدا ہونے والا یہ خیر کا پہلو تھا۔

آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے افراد مختلف نشستیں ''ست سنگ'' کے نام سے کرتے تھے جن میں دوسری پارٹیوں کے افراد کو بھی شریک کرتے۔ مجھے بھی شریک ہونے کا موقع ملتا۔ اس میں ان لوگوں کی طرف سے سوالات کیے جاتے۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جماعت اسلامی اسلام کی روشنی میں افراد کی سیرتیں سنوارنے، معاشرہ کی اصلاح کرنے، برادرانِ وطن تک اسلام کی دعوت پہنچانے اور ملک کی صالح تعمیر و ترقی کا ایک سوچا سمجھا اور واضح نقشہ رکھتی ہے اور جو کچھ بن پڑتا ہے اس ذیل میں اپنی سی کوششیں بھی انجام دیتی ہے اور اس راہ میں قربانیاں بھی دیتی رہتی ہے۔ ہم اس بات کی بھی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ہم اور ہمارے جملہ مسلمان بھائی اسلام کی مخلصانہ پیروی کریں اور اپنے قول و عمل سے باشندگان ملک کے سامنے اسلام کا نمونہ پیش کریں اور اسلامی تعلیمات کے ذریعہ باشندگان ملک کو ان مصائب و خطرات سے نکالنے کی کوشش کریں جن میں وہ گھرے ہوئے ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندوستان مختلف اکائیوں کا گہوارہ ہے، یہاں شہریوں کا یہ بنیادی حق ہے کہ انھیں اپنی پسند کے مذہب پر قائم رہنے اور اس کی تبلیغ و

اشاعت کی آزادی ہو۔ ملک کی ہر جماعت کو خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی یا مذہبی اسے خوش دلی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ تمام بنیادی اور انسانی حقوق ملک کے تمام شہریوں کو حاصل ہیں جس پر کسی پابندی کو روا نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

ایک اور سوال یہ تھا کہ مسلمان عرب اور ایران کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں کہا کہ یہ ایک ذہن ہے جس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ مسلمانان ہند کا ایران وعرب اور ساری دنیا کے مسلمانوں سے ایک دینی اور برادرانہ رشتہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ ہندوستان کے ہندوؤں کا نیپال اور ماریشش کے ہندوؤں سے رشتہ ہے۔ یہ رشتے اگر حق وصداقت کی بنیاد پر قائم ہوں گے تو اپنے ملک بلکہ درحقیقت ساری انسانی برادری کے حق میں موجب فلاح ثابت ہوں گے اور جہاں تک اسلام کا معاملہ ہے ان رشتوں کے سلسلہ میں اس کی ہدایت یہی ہے کہ اصولی بنیاد پر قائم رکھے جائیں۔

اسلام کی دعوت ایک اصولی دعوت ہے جس کے تمام بنی نوع انسان مخاطب ہیں اور امت مسلمہ درحقیقت اسی دعوت کی امین ہے۔ جماعت کی کوشش ہے کہ امت عملاً اسی دعوت کی علم بردار ہو اور اس کا اچھا نمونہ پیش کرنے کے قابل بنے۔

سماج کی تعمیر نو کی ضرورت کے تحت جماعت کے پروگرام کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا جس میں افراد کے اخلاق وکردار کی تعمیر اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ محلوں اور بستیوں کی ہمہ جہتی اصلاح اور رفاہ عام کے مختلف کاموں میں دوسرے افراد اور جماعتوں سے تعاون کی خواہش کی جاتی ہے۔ جماعت خود بھی تعمیری اور اچھے کاموں میں دوسرے اداروں اور جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کی خواہش مند رہی ہے اور دوسری جماعتوں سے تعاون کا دروازہ کھلا ہوا ہے، انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کسی اچھے کام میں دوسروں کے ساتھ تعاون کرنا یا تعاون حاصل کرنا ایک چیز ہے اور کسی دوسرے نظریہ کی حامل جماعت کا پیرو بننا بالکل دوسری چیز ہے۔ اپنے نظریہ کو چھوڑے بغیر کسی دوسرے نظریہ کی پیروی کوئی بھی نہیں کرسکتا۔

ست سنگ کی نشستوں میں آر۔ ایس۔ ایس کے ذمہ داروں نے بتایا کہ وہ

چھوت چھات، ذات پات اور اونچ نیچ جیسی سماجی برائیوں کے خلاف ہیں اور ان کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کردار سازی پر بھی زور دے رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بلاشبہ مضبوط اور اچھے کردار کے بغیر سماج کے اصلاح کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہوسکتی ہے۔ میں نے کہا کہ انسانی زندگی کو نیکی و راست بازی کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ضروری ہے کہ اولاً ہم کو اس کا پختہ یقین ہو کہ جو بھی قوتیں صلاحیتیں ہمیں عطا کی گئی ہیں وہ خالق کائنات کی طرف سے ہمارے پاس امانت ہیں، اور یہ کہ ہم سب اس کے بندے اور غلام ہیں اور ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم بلا تفریق مذہب وملت سارے انسانوں کو جو دراصل اولادِ آدم ہونے کی حیثیت میں بھائی بھائی ہیں فائدہ پہنچائیں۔ ثانیاً خدائے علیم و برتر کے سامنے ہم سب کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ یہ زندگی ایک دن ختم ہو جائے گی اور اگر ہماری نیتیں اور اعمال اچھے ہیں اور ہم نے خدا کے احکام کی اطاعت کی ہے تو وہ ہمیں آنے والی زندگی میں اس کی جزا دے گا، لیکن اگر صراط مستقیم سے ہٹے رہے تو آخرت میں بڑے خسارے میں رہیں گے۔ ثالثاً ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تخلیق کی ابتدا سے ہی تمام قوموں اور ملکوں میں اپنے رسول بھیجے اور کتب ہدایت اتاری ہیں۔ رسالت کے سلسلہ کی آخری کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور قرآن حکیم اللہ کی آخری کتاب ہے۔ اس کتاب ہدایت میں اور اللہ کے آخری رسولؐ کی ذات گرامی میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے متعین اور واضح ہدایات موجود ہیں۔ اچھے کردار کی تعمیر کے لیے اچھے خارجی ماحول کے ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ انسان کا باطن بھی پاکیزہ اور درست ہو۔ باطن کے اصلاح اور تزکیہ کے لیے یہ تصور غیر معمولی طور پر معاون ثابت ہوتا ہے کہ ہر شخص خدائے علیم وخبیر کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہوگا اور اس کو اپنے اچھے برے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ مزید براں اسلام کا یہ تصور کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، لہٰذا وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں — انسانوں میں اخوت و مساوات اور ایک دوسرے کی مدد وغم خواری کا جذبہ ابھارتا ہے۔

مختصراً یہ وہ بنیادی انداز فکر وعمل ہے جو اسلام تمام معاملات میں اختیار کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر معروفات کے قیام اور منکرات کے ازالے کے لیے یہ پروگرام رکھتے ہیں کہ مثالی محلے اور بستیاں بنائی جائیں۔ ہمیں اس پر پورا انشراح ہے کہ اگر ہندوستانی عوام اخلاص اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اس پروگرام کو اپنالیں تو مسائل حکومت کے سہارے کے بغیر بھی حل ہو سکتے ہیں اور اس سے وہ ہم آہنگی بھی پیدا ہو سکتی ہے جس کی ہم سب تمنا کرتے ہیں۔

میں نے توجہ دلائی کہ آر۔ایس۔ایس کی آئیڈیالوجی، اس کا قدیم لٹریچر اور اس کی قدیم روایتیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا کو خوش گوار بنانے میں شدید مانع ہیں، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اس طرح کی روایتوں کے بیان کرنے کا سلسلہ بند کیا جائے تاکہ فرقہ وارانہ فضا اور ہندو مسلم تعلقات ناخوش گوار ہونے سے بچیں۔ جواب میں ایک ذمہ دار صاحب نے فرمایا اب ہمیں اپنے گانوں اور لٹریچر پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور ان سب چیزوں کو نکالنا ہوگا جو تعلقات کی بہتری میں مانع ہیں۔

۱۵ر جنوری ۷۶ء کو سرکل ۳ر اخلاقی قیدیوں سے خالی کرالیا گیا۔ معلوم ہوا کہ تقریباً ۳۰۰ میسا نظر بند آرہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ سنٹرل جیلوں میں پورے صوبے سے میسا نظر بند یکجا کیے جارہے ہیں۔

۱۸ر جنوری کو رفقاے جماعت (جناب عبدالقادر خاں صاحب، سلطان احمد خاں صاحب، مشتاق احمد سالک صاحب، ڈاکٹر عبدالرشید صاحب، حکیم اشرف علی صاحب، اور ماسٹر محمد الیاس صاحب) ضلع بجنور جیل سے آئے۔ انھیں سی کلاس میں رکھا گیا تھا۔ چناں چہ تیسرے سرکل میں بند کر دیا گیا۔ انتہائی جدوجہد کے بعد شام کے وقت چوتھے سرکل میں لایا جاسکا اور ایک ہفتہ کے بعد سپیر کلاس ملا۔

۶ر فروری کو بلند شہر جیل سے عبدالجبار کریمی صاحب اور ریاض الدین صاحب منتقل ہو کر آئے۔ ۲۸ر فروری کو اعظم گڑھ جیل سے محترم مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی اور محترم مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب میسا کے تحت منتقل ہو کر آئے۔ ان حضرات کو تیسرے سرکل میں رکھا گیا۔ اس طرح سنٹرل جیل میں رفقاے جماعت کی تعداد ۱۲

ہوگئی۔ اللہ کے فضل سے ۷ مہینے بعد نماز باجماعت کا موقع ملا۔ قبل ازیں تنہا ہی فرائض ادا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی تھی۔ ۲۷/اپریل سے درس قرآن اور درس حدیث شروع ہوا۔ درس قرآن مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب اور درس حدیث مولانا ابو اللیث صاحب ندوی نے دینا شروع کیا جس میں غیر مسلم حضرات نے بھی شرکت کی۔ علاوہ ازیں میں نے اور سلطان احمد خاں صاحب نے سورۃ ھود کا مطالعہ شروع کیا۔ اللہ نے جو بھی موقع عطا فرمایا اس سے فائدہ اٹھایا۔

جہاں تک جماعت اسلامی ہند کا تعلق ہے یہ واقعہ ہے کہ اس ناروا اور بے جواز پابندی سے اللہ کے فضل سے اسے بہت فائدہ پہنچا۔ اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ وابستگانِ جماعت اخلاقی و روحانی قوت کے اعتبار سے کس حال میں ہیں اور وہ اپنی ذمہ داری سے کس حد تک عہدہ برآ ہوسکتے ہیں۔ ان کے اندر کتنا نظم و ضبط، تنظیمی صلاحیت، محبت و مودت، جرأت و حوصلہ اور مصائب انگیز کرنے کی قوت ہے۔

۱۶/جولائی کو مسٹر فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند نے ایک آرڈی نینس کے ذریعہ ۱۶ (الف) میں ترمیم کردی۔ اب 'میسا' کے تحت کسی کو وجہ بتائے بغیر ۲۴ مہینہ نظر بند رکھا جاسکتا تھا جب کہ اب سے پہلے اس کی میعاد صرف ایک سال تک کے لیے تھی۔ ایسا قانون ایک جمہوری ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ تھا۔

۲۹/جولائی کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ ۷/اگست کو دستور میں ترمیم کے سلسلہ میں اپوزیشن سے رائے لی جائے گی جس کے لیے مسٹر سورن سنگھ کی سفارشات کو پہلے ہی سے اپوزیشن کو دے دیا جائے گا۔

۸/اگست سے برسر اقتدار پارٹی نے دستور ہند میں ہونے والی ترامیم نیز سردار سورن سنگھ کمیٹی کے مشوروں پر حزب اختلاف سے تبادلہ خیال کے لیے مدعو کیا لیکن انھیں پارٹیوں کو جو پہلے ہی سے اقتدار میں شریک اور حمایتی ہیں مثلاً سی۔ پی۔ آئی، مسلم لیگ اور انا درمک۔ ان پارٹیوں کا کوئی فرد جیل میں نظر بند نہیں۔ اور جو پارٹیاں حزب اختلاف میں شامل تھیں مثلاً سی۔ پی۔ ایم، جن سنگھ، سوشلسٹ، ڈراوڈ منتر کازگھام وغیرہ کو تک مدعو نہیں کیا

گیا۔ اِنھیں پارٹیوں کے لیڈرس اور کارکن جیلوں میں نظر بند تھے۔

سی۔ پی۔ ایم لیڈر نمبودری پاد، مسٹر کریم بھائی چھاگلا سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ پارلیمنٹ کی مدت کارکردگی ختم ہوچکی ہے اس لیے وہ عوام کی منتخب کردہ نہیں رہ گئی ہے لہٰذا دستور میں ترمیم کرنے کا اختیار اس کو نہیں ہے۔ پہلے الیکشن ہونا چاہیے کہ عوام ترمیم کے حق میں ہیں یا نہیں، کیوں کہ پارلیمنٹ کے اوپر عوام ہیں نہ کہ عوام کے اوپر پارلیمنٹ۔ اگر موجودہ حکومت ترمیم کرتی ہے تو وہ غاصب ہوگی اور ترمیمات ناجائز ہوں گی۔

۳؍دسمبر کو جماعت اسلامی لکھنؤ کے ایک رکن عابد حسین صاحب مع اپنے ۳ کاروباری ساتھیوں کے جیل آگئے۔ موصوف کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی عیدگاہ میں نماز عید کے موقع پر بک اسٹال لگایا اور نئے سال کے کلینڈر اور ڈائریاں فروخت کیں۔ پولیس نے گرفتار کرلیا اور یہ بے بنیاد الزام لگایا کہ یہ لوگ نس بندی کے خلاف اشتہار تقسیم کررہے تھے۔ مقامی پولیس اور حکام نے اپنی کارکردگی دکھانے اور جماعت کو بدنام کرنے کے لیے یہ ڈرامہ اسٹیج کیا اور ۴ بے گناہ افراد کو عین عید کے موقع پر داخل زنداں کردیا۔ باوجود کوشش کے سیاسی قیدیوں کے ساتھ نہیں رکھا بلکہ اخلاقی قیدیوں میں پہنچادیا گیا۔

۱۱؍دسمبر کو جے گرودیو کے ۳۰ چیلے ستیہ گرہ کرتے ہوئے جیل میں آگئے۔ ۶ طلبہ کو لکھنؤ یونیورسٹی سے پولیس نے گرفتار کیا۔ انہیں ریفارمیٹری میں بھیج دیا گیا۔

۱۸؍جنوری ۷۷ء کو اچانک وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اعلان کیا کہ مارچ ۷۷ء میں پارلیمنٹ کے الیکشن ہوں گے۔

۲۰؍جنوری ۷۷ء کو غیر کمیونسٹ حزب اختلاف نے جیل ہی سے الیکشن کے لیے ایک پارٹی ''جنتا پارٹی'' کے نام کا اعلان کردیا۔ اپوزیشن کی طرف سے اتحاد کا یہ بہت بڑا قدم تھا۔

اخبارات اور ریڈیو سے برابر سیاسی نظر بندوں کی رہائی کا اعلان ہورہا تھا لیکن عملاً

ایسا ہونہیں رہا تھا۔ صرف پروپگینڈہ کیا جارہا تھا۔ البتہ اخلاقی قیدیوں، غنڈوں وغیرہ کے میسا منسوخ کیے جارہے تھے۔ ممنوعہ جماعتوں کے افراد کی رہائی سے بالکل انکار کردیا گیا۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔

یکم فروری ۷۷ء کو بزرگ کانگریسی رہنما بابو جگ جیون رام فوڈ منسٹر نے کیبنٹ اور کانگریس کی ابتدائی رکنیت سے استعفادے دیا جس سے حکومت میں کھلبلی مچ گئی۔ مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا چیف منسٹر اتر پردیش بھی کانگریس کی ابتدائی رکنیت سے مستعفی ہوگئے، معروف خاتون لیڈر نندنی ستپتھی نے بھی جگ جیون رام اور بہوگنا کی تقلید کی۔

صدر جمہوریہ الیکشن کا اعلان کرنے کے بعد ملائیشیا کے دورے پر چلے گئے تھے۔ صدر کے ملائیشیا کا دورہ منسوخ کرنے اور جلد بھارت واپس آنے کے لیے مسز گاندھی نے اپنا خصوصی مسینجر بھیجا۔ صدر جمہوریہ بیرونی سفر سے لوٹے ہی تھے کہ ۱۱ر فروری کو آخری سفر پر روانہ ہونا پڑا۔

نائب صدر جمہوریہ مسٹر بی ڈی جتی نے چارج سنبھال لیا۔

بالآخر اللہ کی رحمت سے ایمرجنسی کی سیاہ رات کا اختتام ہوا، آزادی کی روشن صبح نمودار ہوئی، آمریت پر جمہوریت کی فتح ہوئی، بھارت کے عوام نے ثابت کردیا کہ وہ جمہوریت کو پسند کرتے ہیں۔ مسز گاندھی اور ان کے ساتھیوں کو پارلیمنٹ کے الیکشن میں شکست فاش کا منھ دیکھنا پڑا۔

ایمرجنسی میں جن جماعتوں کو ممنوعہ قرار دیا گیا تھا ان پر سے پابندی اٹھالی گئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے جماعت اسلامی ہند کی آزمائش کا باعزت طریقہ پر خاتمہ ہوگیا۔ **الله غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون.**

بالا صاحب دیورس کے ساتھ

□ مصطفیٰ خاں
جھانسی (یوپی)

ایمرجنسی کے دنوں میں میں اپنی ریلوے ملازمت کے سلسلہ میں شولا پور میں تھا۔ ۴/جولائی ۷۵ء بروز جمعہ جب کہ میں ریلوے ڈیوٹی کے سلسلہ میں ڈونڈ ریلوے آفس میں تھا کہ گرفتار کرلیا گیا اور میرے دو ساتھی ارکان جماعت جناب سرفراز حسین اور جناب شیخ عبدالمجید ریلوے گارڈس کو شولا پور میں گرفتار کیا گیا۔ مجھے پولیس رات کی گاڑی سے شولا پور لے آئی جہاں میرے دونوں رفقاء آر۔ایس۔ایس اور آنند مارگ کے ورکرس کے ساتھ سرکاری سرکٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ یہاں پولیس نے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا انتظام کیا تھا۔ کلکٹر صاحب بھی ۵/تاریخ کو دن میں ہم لوگوں سے ملنے سرکٹ ہاؤس آئے اور کھانے پینے کے انتظام کے بارے میں معلوم کیا۔ دوسرے دن یعنی ۶۔تاریخ کو رات ایک بجے پولیس وین کے ذریعہ ہم تمام ۸/افراد کو میسا کے تحت پونہ سنٹرل جیل بھیج دیا گیا، تلک وارڈ کے ایک بیرک میں پہنچایا گیا وہاں ہر طرح کا انتظام تھا۔ پلنگ، میز، کرسیاں، مچھر دانی وغیرہ۔ اس بیرک میں ہم سے پہلے قریب دس لوگ آر۔ایس۔ایس کے موجود تھے۔ پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد آر۔ایس۔ایس چیف آنجہانی بالا صاحب دیورس گاندھی وارڈ سے ہم لوگوں سے ملنے آئے۔ تعارف کے بعد انھوں نے فرمایا کہ خان صاحب ابھی پانچ سال تو آرام سے رہئے، پھر دیکھا جائے گا۔ اسی روز ہم لوگوں کے جیل پہنچنے کے بعد قریب ایک بجے دن مہاراشٹر آر۔ایس۔ایس کے چیف بابا بھڑے بھی لائے گئے۔ ہم

لوگوں کا بھی تعارف ہوا۔ بابا بھڑے آر۔ایس۔ایس کے پالیسی ساز، ان کی مرکزی شوریٰ کے صفحہ اول کے ممبر، اپنے موقف میں بڑے ہی سخت اور پونا کے بڑے بااثر سینئر وکیل تھے۔ اخیر تک ہم لوگوں کے بیرک ہی میں رہے۔ بیرک کے باہر دالان میں ہی ایک طرف نماز پڑھنے کی جگہ بنالی گئی تھی۔ باآواز بلند اذان پکارتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد درسِ قرآن کا سلسلہ بھی قائم کر رکھا، جس میں آر۔ایس۔ایس کے لوگ بھی شریک ہوجایا کرتے تھے۔ اکثر سوال وغیرہ بھی کرتے تھے جن کا اپنی حد تک جواب بھی دیا جاتا تھا۔ محترم مولانا رشید عثمانی صاحب ہم لوگوں سے ملنے جیل آیا کرتے تھے۔ جاڑے کے موسم میں مولانا نے سوئٹر بھی فراہم کیا تھا۔ ان کے اور مرحوم محمد یوسف عطار صاحب کے لڑکوں کے ذریعہ مرہٹی، ہندی اور انگلش زبان میں اسلام پر بنیادی کتابیں پہنچ جایا کرتی تھیں۔

چند مہینوں بعد ناسک جیل سے غلام رسول دیشمکھ اور جلگاؤں سے جماعت کے دوسرے رفقا بھی منتقل ہوکر پونا جیل آگئے تھے، بعد میں بھیونڈی کے مولانا محمد حسین اسلمی صاحب بھی آگئے۔ اس طرح ہم جماعت اسلامی کے ۱۰/افراد اور ایک صاحب بمبئی کے ڈاکٹر نائک کے بھائی رتناگری سے پونا آگئے تھے۔ اس طرح ہم گیارہ مسلمان تھے۔ درس قرآن کے سلسلے اور کتابیں وغیرہ جو آر۔ایس۔ایس کے حضرات کو ہم لوگ فراہم کر رہے تھے اس سے جیل میں ہمارے لیے اچھا ماحول پیدا ہوگیا۔

قریب چھ ماہ بعد گورنمنٹ کی طرف سے ایک فارم آیا کہ جو اس پر دستخط کردے گا اس کو رہائی مل سکتی ہے۔ آر ایس ایس کے لوگ یہ فارم بھر بھر کے جیل سے باہر جارہے تھے۔ اسی موقع پر میرے گھر سے میری بیٹی کا خط آیا کہ ابا ہم نے سنا ہے کہ لوگ معافی مانگ مانگ کر جیل سے باہر آرہے ہیں، خدا کے واسطے آپ ہم لوگوں کی وجہ سے ایسا نہ کریں۔ یہ خط شام کی میٹنگ میں ۵ ہزار اہل زنداں کو آر۔ایس۔ایس کے حضرات نے سنایا، کیوں کہ آر۔ایس۔ایس کے ذمہ دار اس بات کو پسند نہیں کر رہے تھے کہ ان کے لوگ اس طرح جیل سے باہر جائیں۔ اسی دوران بھساول کے غلام رسول دیشمکھ صاحب کے لیے یہ خبر آئی کہ جلگاؤں کے کلکٹر کی طرف سے ان کی رہائی کے آرڈر آگئے ہیں۔ شام کو عصر، مغرب کے

درمیان جب ہم قریب دوسو لوگ دیشمکھ صاحب کو گیٹ تک پہنچانے گئے تو چند منٹ کے بعد وہ پھر واپس آ گئے۔ بتایا کہ کلکٹر جلگاؤں نے لکھا ہے کہ اگر دیشمکھ صاحب فارم پر دستخط کر دیں تو ان کو رہائی دے دی جائے۔ اس پر دیشمکھ صاحب نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور واپس بیرک کی طرف لوٹے۔ آر۔ ایس۔ ایس کے لوگ ان کو کاندھوں پر بٹھا کر واپس لے آئے۔ اس کا آر۔ ایس۔ ایس والوں پر بڑا اثر ہوا۔ بالا صاحب دیورس صاحب نے کہا کہ جماعت والے اخلاقی اور عملی اعتبار سے عام مسلمانوں سے بلند ہیں۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ یہ سب اسلامی تعلیمات کو ٹھیک سے سمجھنے اور عمل کرنے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اسی درمیان ایک دن بالا صاحب دیورس نے مجھ سے کہا کہ اس عرصہ میں آپ لوگوں سے بات چیت اور کتابوں کے مطالعہ سے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئی ہیں، میں کوشش کروں گا کہ آر۔ ایس۔ ایس مسلمانوں کے لیے اپنا دروازہ کھولے۔

رہائی کے بعد ۱۹۷۸ء میں میں ٹرانسفر ہو کر اپنے وطن جھانسی آ گیا۔ جھانسی سے ناگپور کے پتہ پر میں نے دیورس صاحب کو کئی خط لکھے۔ ایک خط میں ان کو لکھا کہ آپ جب بھی جماعت اسلامی ہند کے مرکزی ذمہ داروں سے دہلی میں ملنے کا پروگرام بنائیں مجھے تحریر فرما دیں جس سے آپ کو دہلی میں دفتر جماعت پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ ۱۹۸۰ء میں دیورس صاحب شمالی ہند کے دورے پر نکلے تو جھانسی بھی تشریف لائے۔ میں بھی اپنے آفس سے اسٹیشن گیا تو وہاں بڑے تپاک سے مجھ تک آئے اور گلے لگا لیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا ہمارے امیر جماعت اسلامی ہند سے ملاقات کا کیا خیال ہے؟ تو بتایا کہ اس سفر میں دہلی کا دورہ بھی شامل ہے، میں فلاں تاریخ کو دہلی پہنچ رہا ہوں، اس موقع پر ملاقات کر لوں گا۔ آپ بھی دہلی پہنچ جائیں۔ اسی طرح بات چیت کرتے ہوئے مجھے بھی جیپ میں بٹھا کر اپنی قیام گاہ پر لے گئے، جہاں جھانسی کے آر۔ ایس۔ ایس کے ذمہ دار موجود تھے، ان سے میرا تعارف کرایا، جیل کے واقعات سناتے رہے اور تعریف کرتے رہے۔ مجھ سے کہا کہ کل صبح ۷/ بجے پریس والوں کو بلایا ہے، آپ بھی اپنے رفقا کے

ساتھ تشریف لائیے گا۔

دیورس صاحب نے مجھ سے اظہار خیال کی خواہش کی جس پر میں نے پونہ جیل میں آر۔ایس۔ایس کے حضرات کے ساتھ گزرے ہوئے ایام کا تذکرہ کیا۔ چند دوسرے سوالات ہمارے دوسرے ساتھیوں نے کیے۔ میرے سوالات کے بعد دیورس صاحب نے تقریر کی جس میں اپنی جماعت کا تعارف کرایا اور ہمارے سولات کے بارے میں کہا کہ شام کو پبلک جلسے میں جواب دئے جائیں گے، لیکن شام کے جلسہ میں کوئی جواب نہیں دیا اور رات ہی میں کانپور چلے گئے۔ وہاں انھوں نے جو تقریر کی اس میں کہا کہ جھانسی کی جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے آر۔ایس۔ایس کو غیر فرقہ پرست نظم وڈسپلن والی جماعت بتایا ہے، کیوں کہ جماعت والے کئی ساتھی میرے ساتھ پونہ جیل میں رہے ہیں۔ اس پر کانپور کے اردو اخبارات نے پہلے صفحہ پر سرخیوں میں لکھا کہ ''آر۔ایس۔ایس غیر فرقہ پرست اور دودھ کی دھلی ہوئی جماعت۔ جماعت اسلامی کے مولویوں کا فتویٰ'' اس پر مرکز جماعت اسلامی سے کانپور کے اخبارات کی کٹنگ اور اس پر میری رپورٹ طلب کی گئی۔ میں جھانسی کے مقامی ہندی اخبارات کے ساتھ دہلی گیا، کیوں کہ مقامی ہندی اخبارات میں ہم لوگوں کے سوالات اور دیورس صاحب کی تقریر چھپی تھی۔ اس طرح مرکز نے ہندی اخبارات کی خبروں کی کاپی کے ساتھ کانپور کے اخبارات کو خطوط لکھے۔

میں نے بھی دیورس صاحب کو جھانسی سے خط لکھا کہ آپ نے کانپور میں جماعت اسلامی جھانسی کے بارے میں کیا غلط بیانی کردی، ساتھ میں کانپور کے اردو اخبارات کی خبروں کی کاپی اور خبروں کا ہندی ترجمہ کر کے ان کو بھیجا اور خواہش کی کہ آپ اردو اخبارات کی خبروں کی تردید کریں اور خود مجھ کو جواب تحریر فرمائیں، لیکن اس کا بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ اسی موقع پر میں دہلی میں بی جے پی آفس گیا اور معلوم کیا کہ دیورس صاحب کا دہلی کب تک آنے کا پروگرام ہے؟ وہاں میری ملاقات بی جے پی کے پونہ جیل کے ایک ساتھی سے ہوگئی۔ انھوں نے دیورس صاحب کے دہلی آنے کی تاریخ بتائی اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے میرے بارے میں بتاتے رہے۔ پونا جیل کی محبتوں کا ذکر کرتے رہے اور چائے

مٹھائی وغیرہ سے تواضع کی۔ میں نے ان سے بھی کانپور میں دیورس صاحب کی تقریر کا ذکر کیا لیکن انھوں نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے بعد دیورس صاحب جس تاریخ کو دہلی پہنچنے والے تھے اس تاریخ کو میں دہلی بی جے پی آفس پہنچا تو معلوم ہوا کہ دوپہر تک دیورس صاحب آنے والے ہیں۔ ظہر کی نماز کے بعد پھر میں ان کے دفتر گیا تو معلوم ہوا کہ دیورس صاحب فرید آباد کار کے ذریعہ پہنچ گئے ہیں اور شام کو فرید آباد میں پروگرام ہوگا اور وہیں سے آگے چلے جائیں گے۔ اس طرح ان کے انتقال تک نہ تو ان کا کوئی خط ملا اور نہ ہی ملاقات ہوسکی۔

لکھنؤ - بریلی - لکھنؤ

☐ رحمت الٰہی
لکھنؤ (یو۔پی)

ایمرجنسی ۱۹۷۵ء میں جماعت پر پابندی لگنے کے بعد ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ جماعت کے ممتاز ذمہ داران کو ہی گرفتار کیا جارہا ہے مگر ۴؍جولائی کو رات ۱۲؍بجے کے قریب جب کہ موسلا دھار بارش ہورہی تھی مولانا عبدالغفار ندوی صاحب نے مجھے گھر پر آواز دی اور کہا کہ باہر تشریف لائیے۔ میں باہر آیا تو دیکھا کہ مولانا کے ساتھ دو یا تین پولیس والے ہیں۔ میں نے کہا فرمائیے! تو پولیس والوں نے کہا کہ چلیے ذرا کچھ کام ہے۔ میں ساتھ میں دفتر کی طرف گیا جہاں پولیس کی جیپ کھڑی تھی اور امیر جماعت اسلامی لکھنؤ جناب م۔نسیم صاحب اس میں موجود تھے۔ اسی پر میں اور مولانا عبدالغفار صاحب بیٹھ گئے اور جیپ وزیرگنج تھانے آگئی۔ ہم ایک روم میں کرسیوں پر بٹھادئے گئے اور ایک انسپکٹر نے کچھ رسمی معلومات حاصل کیں پھر وہ اٹھ گیا۔ ہم وہیں بیٹھے رہے، صبح کو وہیں فجر پڑھی۔ ۷۔۸ بجے جناب مشتاق صاحب، جناب م نسیم صاحب کے بھائی پہنچے، پوچھا کہ ضمانت وغیرہ کی ضرورت ہو تو فراہم کی جائے۔ انسپکٹر نے کہا میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، میں اوپر کی ہدایت کا پابند ہوں۔ تھانے پر ہی ظہر پڑھی گئی، پھر ہمیں چوک کوتوالی میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور چالان کا آرڈر لے کر وہیں سے ڈسٹرکٹ جیل لکھنؤ پہنچادیا گیا۔

جیل میں سرکل کی بیرک نمبر ۶ حصہ میں آئی۔ دو تین روز میں اور کافی سیاسی قیدی آگئے جو آر۔ایس۔ایس، جن سنگھ، آنند مارگ، سوشلسٹ پارٹی، جے گرودیو وغیرہ سے تعلق

رکھتے تھے۔ پھر ہم لوگوں کو بیرک ۵ میں منتقل کر دیا گیا جس میں صرف سیاسی قیدی تھے۔ چند روز میں م۔ نسیم صاحب کو بلا کر ماڈل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اب میں اور مولانا عبدالغفار صاحب ایک ساتھ رہ گئے، باقی دوسری پارٹیوں کے افراد تھے۔ میں نے گھر سے ایک چھوٹی حمائل منگالی تھی اور جیل کی تنہائی میں حتی الوسع باری باری چار چار پانچ پانچ پارے پڑھ کر ہم حمائل ایک دوسرے کو دے دیتے۔ دس پندرہ روز کے بعد کچھ لوگوں کو سی کلاس کے بجائے بی کلاس دے دی گئی جس میں مولانا عبدالغفار صاحب کا بھی نام تھا، اس طرح وہ بی کلاس کی بیرک میں بھیج دئے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قریب ڈیڑھ ماہ میں سیاسی لوگوں کا دباؤ جیل پر بڑھا تو بی کلاس اور سی کلاس کے تمام قیدیوں کو رفارمیٹری اسکول میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں اسکول کی طرح بڑے بڑے کمرے اور ہرا میدان تھا۔ بی اور سی کلاس کا کھانا مشترک طور پر یکساں بنایا جانے لگا تھا۔ چھ ماہ بعد ۱۴ر دسمبر کو رہائی کا فرضی ڈرامہ کر کے مجھے پولیس کسٹڈی میں جیل سے نکال کر حضرت گنج کوتوالی میں کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے میسا لگا دیا گیا۔

آر۔ ایس۔ ایس کے کچھ لوگ بیرک نمبر ۵ میں گیتا کے تھوڑے تھوڑے اشلوک پڑھتے اور اس کی تشریح کرتے تھے جس میں سبھی قیدی شریک کر لیے جاتے تھے۔ جب وہ لوگ گیتا کی تشریح مکمل کر چکے تو انھوں نے طے کیا کہ ہر مذہب والے کو ایک ایک ماہ کا موقع دیا جائے۔ اس طرح اسلام کے بارے میں بتانے کا ہمیں بھی ایک مہینہ ملا اور روزانہ صبح کے وقت درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ایک دن مولانا عبدالغفار صاحب کے سر میں شدید درد تھا لہٰذا مجھ سے فرمایا کہ آج تم درس دو گے۔ میں نے غالباً سورۃ النبا کا پہلا رکوع پڑھ کر اس کا ترجمہ کیا پھر اس کی تشریح وغیرہ کی۔ درس کے بعد لوگ سوالات کرتے تھے، مجھ سے بھی سوالات کیے گئے، میں نے جوابات دئے۔ مولانا نے درس کے بارے میں لوگوں کے تاثرات جان کر اطمینان کا اظہار کیا۔ میں نے مولانا سے عربی سیکھنا شروع کی اور کورس مکمل کر لیا۔ اس کی اطلاع جب م۔ نسیم صاحب کو ماڈل جیل میں ہوئی تو خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی محرومی پر افسوس کرنے لگے۔

جیل کے ان ایام میں ہمارے دوسرے رفقا گرفتار کر کے لائے جاتے رہے۔ ملیح آباد کے منشی ہدایت علی صاحب ایسی حالت میں لائے گئے کہ ضعیفی کی تقریباً ۸۸ سال عمر، اس پر مزید یہ کہ شدید پیچش کی کمزوری میں دیوار پکڑے پکڑے بیت الخلاء جاتے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ وہ بجلی کے کھمبے پر چڑھے ہوئے تار کاٹ رہے تھے۔ چند روز وہ جیل کے اسپتال میں رہے پھر وہیں جیل میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے علاوہ عبد القدوس صاحب رحیم آباد، بشیر احمد صاحب ملیح آباد، عبد المعبود خاں، عابد حسین صاحب لکھنؤ اور ہمارے ایک اور سابق رکن نظیر احمد صاحب بھی وہاں لائے گئے تھے۔ چھ مہینے کے بعد مجھے بھی بی کلاس میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

ڈسٹرکٹ جیل میں ایک سال کے قریب مدت گزارنے کے بعد ایک مرتبہ جب مجھے کورٹ لے جایا گیا تو وہاں سے واپسی پر بلا کسی پیشگی اطلاع کے اُس دن کورٹ جانے والی پوری ٹیم کو ماڈل جیل پہنچا دیا گیا جہاں مجھے پھر م۔ نسیم صاحب کا ساتھ مل گیا۔ لیکن چند ہی مہینے بعد ان کو پیرول مل گئی اور وہ چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد مجھے بریلی بھیج دیا گیا۔ بریلی جا کر وہاں بہت سے دوسرے رفقا سے ملاقات ہوئی جن میں محترم مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی صاحب مرحوم اور مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب مرحوم، محترم عبد القادر صاحب، عقیل الدین صاحب نجیب آباد، اشرف علی صاحب اور ماسٹر الیاس صاحب سیوہارہ وغیرہ شامل تھے۔

بریلی جیل میں ہمارے رفقا دو مختلف بیرکوں میں بٹے ہوئے تھے۔ دن میں تو ملتے رہتے تھے لیکن رات کو الگ الگ بند ہوتے تھے۔ مغرب عشاء کی نمازیں اکثر الگ ہوتی تھیں۔ پھر رمضان آ گیا۔ تراویح کا مسئلہ سامنے تھا۔ مولانا ابواللیث صاحب نے تراویح مجھ سے پڑھوائی۔ ۹/ رمضان کو میں نے آخری تراویح پڑھائی، پھر مجھے لکھنؤ ہائی کورٹ کی پیشی میں حاضر ہونے کے لیے آنا تھا جس کو میں نے اپنی بیٹی کے آپریشن کے لیے پیرول کے لیے درخواست گزاری تھی۔ اس طرح مجھے ایک بار پھر واپس ڈسٹرکٹ جیل میں آنے کا موقع مل گیا اور مولانا عبد الغفار صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ پھر جب میسا رد ہوا تو میسا کے سب قیدی رہا کر دیے گئے، لیکن مجھے رہا نہ کیا گیا۔ میں نے ذمہ دارانِ جیل سے کہا کہ

اب کیا معاملہ ہے؟ وہ کہنے لگے آپ پر ڈی آئی آر ہے اس کی ضمانت کرائیے تب جاسکیں گے۔ میں نے کہا کہ ڈی آئی آر میں ہائی کورٹ نے ہماری ہیبئس کارپس (Habeas Corpus) الاؤ کر دی تھی اور مجھے آپ لوگوں نے فرضی طور پر جیل سے نکال کر میسا لگا دیا تھا۔ اب اگر آپ لوگ مجھے قید رکھنے کی ضد کریں گے تو میں کنٹمپٹ آف کورٹ دائر کر دوں گا جس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی، تب وہ لوگ گھبرائے، کاغذات ڈھونڈے لیکن آرڈر ان کو نہیں مل رہا تھا۔ پھر میں نے ان کو تاریخ بتلائی تب ان کو اس تاریخ کی ڈائری میں آرڈر نوٹ کیا ہوا ملا۔ اس طرح مجھے رات نو بجے کے بعد جیل سے رہا کیا گیا اور میں اللہ کے فضل سے اپنے گھر میں آ گیا۔ فللہ الحمد۔

حق گوئی و بے باکی

□ محمد زین الحق
فتح پور (یوپی)

جماعت اسلامی ہند کی پہلی کرن مجھے مولانا ضیاء النبی العباس رکن جماعت کانپور سے ملی، میرے بڑے بھائی رکن جماعت نے بھی مجھے سمجھایا۔ میں مدرسہ الٰہیات حلیم کالج کانپور کے اجتماع میں شریک ہوا تو بہت متاثر ہوا۔ راہ حق کی تلاش تھی جو مل گئی۔

پورا خاندان مجھے چھوڑ کر پاکستان چلا گیا، لیکن میں اعلانِ مرکز سے متاثر رہا کہ ہم سب چلے گئے تو اقامت دین کی جدو جہد اور دعوت حق کون کرے گا اور اللہ کے یہاں جواب دہی ہوگی۔

اسی دعوت دین اور اظہار حق کے جرم میں ۳؍جولائی ۱۹۷۵ء جمعہ کو ہم لوگ جیل پہنچے۔ کچھ دیر بعد گوری شنکر ایم پی نے کہا کہ ہمارے ساتھ کرمنل قیدی نہیں رہ سکتے، چناں چہ آرڈر ہو گیا کہ کرمنل قیدی دوسری بیرک میں چلے جائیں۔ اس وقت ۶ کرمنل مسلمان تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ مایوس ہونگے اور میں ان کی تعلیم و تربیت سے محروم ہو رہا ہوں۔ میں نے بستر اٹھایا سامان لیا اور ان سب کے ساتھ ہو گیا اور رفقا بھی ساتھ ہو گئے۔ اس کا پہلا اثر سب ہی پر ہوا۔ نماز با جماعت کے لیے آسانی ہو گئی۔

۵؍جولائی سے آخر وقت تک اذان کہہ کر نمازیں پڑھیں۔ الحمد للہ عملی زندگی کا یہ فائدہ ہوا کہ تحریک کا عمدہ تعارف ہوا۔ لوگوں کو کہتے سنا کہ ہم نے آج ہی جماعت کو جانا۔

۳؍جولائی ۷۵ء بعد نماز جمعہ حسب الحکم راقم الحروف نے حمد و ثنا کے بعد عرض کیا

کہ ساتھیو! حکومت نے ہم سب کو اقامت دین کی جدوجہد کے جرم میں قید و بند میں مبتلا کیا ہے جو ایک ہی راہ کے مسافر ہیں، ان حالات میں ہمیں صبر سے کام لینا ہے۔ اخوت، محبت، خلوص، اتفاق و اتحاد ہمارا شعار ہوگا۔

اس کے بعد طے ہوا کہ یہاں ہمیں ضابطہ کے مطابق دن گزارنے ہیں:

جس ساتھی (دیگر عام قیدی) کو نماز نہیں آتی اسے نماز یاد کرانی ہے۔

بعد نماز فجر اور عصر درس قرآن ہوا کرے گا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کرمنل قیدیوں سے بیرک بھر گئی۔ دو دن گزرے کہ شور و غل بڑھ گیا، ڈکیتی، اغوا، قتل کے ''کارنامے'' بڑھ چڑھ کر بیان کیے جانے لگے۔ چرس، گانجہ کی دھوم شروع ہوئی اور رنگ محفل بگڑتا نظر آیا۔ میں نے ایک دن قیدیوں کو خاموش کر کے انھیں مخاطب کر کے کہا کہ ساتھیو! یہ جیل ہے۔ فرصت کا وقت ہے، یہاں ہفتہ میں ایک بار تھوڑی دیر سنجیدہ غور و فکر کرنا اور اپنے غلط کاموں پر نادم ہونا چاہیے۔ چوں کہ میرا مخاطب کرنا نرمی، ہمدردی اور پیار و محبت کے ساتھ تھا، ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ سب نے بات مان لی۔ چرس، گانجہ بالکل بند ہو گیا۔

یہاں ہمارے درج ذیل ساتھی تھے:

۱۔ سعید اختر صاحب، ناظم ڈویژن ۲۔ محمد اختر صاحب ۳۔ اظہر بیگ صاحب اور میں خود ''محمد زین الحق''۔

ایک دن جناب صلاح الدین صاحب (موجودہ ایم ایل اے) ایک وارڈ کی رونمائی میں تشریف لائے اور ملاقاتیں کیں، بعد میں مجھے علیٰحدہ بلایا اور تنہائی میں فرمایا کہ اگر آپ کچھ لکھ کر دے دیں کہ میں جماعت اسلامی کے دستور کے کسی دفعہ سے متفق نہیں، نہ میں رکن جماعت ہوں تو ابھی آپ کو جیل سے باہر نکال لوں گا۔ میں نے سنا، ہنس دیا اور عرض کیا کہ وکیل صاحب آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے دستور کے ایک ایک نقطہ پر میں متفق ہوں، ذرا بھی اختلاف نہیں، نہ میں رہائی کا خواہش مند ہوں، آپ کی نصیحت فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ میری بات سن کر

موصوف دم بخود ہو گئے اور فرمایا آپ ضد کر رہے ہیں۔ خیر آپ جو خصوصی امداد چاہتے ہوں وہ جاری کروادوں۔ میں نے جواب دیا کہ اپنے رفقائے کرام کو چھوڑ کر میں کسی بھی رعایت کا خواہش مند نہیں ہوں۔ ایم ایل اے صاحب کی رازدارانہ گفتگو اور اپنا جواب میں نے سعید اختر صاحب سے بیان کر دیا۔ موصوف نے فرمایا آپ آزمائش میں کامیاب رہے۔

جیل سے عدالت میں ایم پی، ایم ایل اے، لکچرار، وکلا سب ہتھکڑیوں میں لے جائے جاتے تھے۔ تیسرے رمانڈ پر میں نے دستخط کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجسٹریٹ کے سامنے دستخط کروں گا۔

بحث مباحثہ کے بعد مجھے ایسے وقت عدالت لے جایا گیا جب حاکم چمبر میں جا چکا تھا۔ میں چمبر میں پہنچا اور دریافت کرنے پر تمام شکایات اور مسائل اس کے سامنے بہت تفصیل سے رکھ دئے۔ اس نے غور سے سننے کے بعد حکم دیا کہ ہتھکڑیاں کھول دی جائیں۔ عوام سے ملنے کی اجازت دی جاتی ہے اور سیاسی قیدیوں کی جگہ صاف ستھری علیٰحدہ کر دی جائے، ضروری سامان اور عام قیام گاہ کے اندر ملاقاتوں کی اجازت بھی دی جاتی ہے۔ چناں چہ ملاقاتیں ہونے لگیں، لکچرار، ایم ایل اے، ایم پی، ایڈوکیٹ اور ڈاکٹروں وغیرہ نے مجسٹریٹ سے میری ملاقات کو سراہا اور کہا کہ حق صاحب آپ نے بڑا کام کیا! میں نے عرض کیا کہ میری یہ بیبا کی صدقہ ہے تحریک اسلامی کا۔

خطرناک قیدی

❑ منظور احمد خاں
مورانواں ضلع اناؤ (یوپی)

۳؍جولائی ۱۹۷۵ء کو اخبار قومی آواز میں یہ خبر پڑھی کہ کچھ دوسری پارٹیوں کے ساتھ جماعت اسلامی پر بھی پابندی لگا دی گئی ہے اور جماعت کے مرکزی ذمہ داروں کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔

۴؍جولائی کو فقیر محمد صاحب رکن جماعت کو حیدر آباد جانا تھا۔ موصوف کو بھیجنے کے لیے بس اسٹینڈ مورانواں پہنچا۔ جانے سے قبل راقم نے اپنی ہارڈ ویئر کی دوکان جو اسٹیشن کے قریب تھی کھول دی تھی، سوچا تھا کہ فقیر محمد صاحب کو بھیج کر ابھی واپس آجاؤں گا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔

میں اسٹیشن کی سڑک پر تھا کہ تھانہ انچارج مورانواں بلٹ سے آتے نظر آئے، گاڑی ہمارے پاس روک دی۔ موصوف پہلے سے متعارف تھے۔ کہا کہ آپ ہمارے ساتھ تھانہ تک چلیں گے اور پھر ابھی آپ کو واپس بھیج دیں گے۔ ہم گاڑی پر بیٹھ گئے۔ تھانہ لے جا کر کہا کہ منظور صاحب آپ کو واپس نہیں جانا ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ کیش اور گھڑی اپنے گھر بھجوادو۔ یہ کہہ کر انچارج اشوک کمار سنگھ اپنی رہائش گاہ کی طرف مڑ گئے۔ مجھے کرسی دی گئی۔ دل کو یکسوئی اور یک گونہ طمانیت حاصل تھی جو میرے مولا کی دین تھی۔ جمعہ کا دن تھا، کہا کہ جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے آجاؤں گا، مگر اجازت نہیں ملی، مجبوراً وہیں نماز ظہر پڑھی۔ گھر اور جماعت کے حلقہ کے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ گرفتاری کی خبر سے لوگ حیرت میں پڑ گئے،

میرا چھوٹا بچہ اخوان عالم، والد صاحب کے ہمراہ آیا، اس کو میں بے انتہا چاہتا تھا۔ اس کی طرف قصداً ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔ بہر کیف چلنے کا حکم صادر ہوا۔ گھر سے کپڑے وغیرہ اور تفہیم القرآن کا تیسرا حصہ منگوایا، تھانہ میں منی بس آئی، میں پولیس فورس کے ساتھ اناؤ روانہ ہوا۔ شام کو اناؤ جیل پہنچا دیا گیا۔

جیل افسروں نے ضابطہ کی کارروائی مکمل کی۔ جیل میں معلوم ہوا کہ وہاں پہلے سے ہی یہ افواہ گرم تھی کہ بڑے ہی خطرناک قسم کے قیدی آرہے ہیں۔ ایک کمپاؤنڈ کے اندر دو بیرکس ۱۶ اور ۱۷ نمبر انہیں قیدیوں کے لیے پہلے سے ہی خالی کرالی گئیں تھیں۔ جیل میں اس کا بڑا چرچہ تھا۔ ۱۷ نمبر بیرک میں پہنچا دیا گیا، جہاں پر ہمارے دوست پرنسپل ہنس راج شرما جی نے جو آر ایس ایس سے متعلق تھے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے استقبال کیا۔ موصوف سے پہلے ہی دعوتی روابط تھے، بہت سا لٹریچر فراہم کیا تھا۔ انہیں ہندی، انگریزی کے مترجم قرآن شریف دے رکھے تھے۔ آہستہ آہستہ لوگ آتے رہے۔ جماعت کے محترم حکیم عمادالدین صاحب وعبداللطیف صاحب، کافی تعداد میں آر ایس ایس کے لوگ جن میں وکلا، ماسٹر بھی شامل تھے۔

چند مافیا لیڈر اور اسٹوڈنٹ لیڈروں کو بھی ہماری بیرک میں ڈی آئی آر کے تحت رکھا گیا۔

آر ایس ایس کے لوگ اسی کمپاؤنڈ میں شاکھائیں چلاتے رہے اور پنج وقتہ نماز کے علاوہ ہم نے درس قرآن، درس حدیث، مطالعہ لٹریچر بھی شروع کر دیا۔

جماعت اسلامی کے افراد کے کردار اور سرگرمیوں سے آر ایس ایس کے حضرات پہلے ہی سے متاثر تھے، خصوصاً پڑھے لکھے لوگ۔ ہنس راج شرما جی نے قرآن شریف پڑھنے کی خواہش کی۔ اس ضمن میں مولانا عمادالدین صاحب اور راقم الحروف نے موصوف کو تعاون دیا۔ موصوف کو اتنی دلچسپی تھی کہ جیلر صاحب سے جلی حروف کا قرآن شریف باہر سے منگوایا کیوں کہ ان کی بینائی کمزور تھی۔

آپ کا ہم لوگوں کے قریب ہونا آر ایس ایس کے لوگوں کو عجیب سا لگا۔ شرما جی ریفیو جی ہیں، انھوں نے تحصیل پوروہ میں جو ہمارے قصبہ مورانواں سے ۱۲ کلومیٹر پر واقع

ہے وہاں پر بڑی ہی جدوجہد کے بعد انٹر کالج قائم کیا۔ علمی صلاحیت کے اعتبار سے انگلش میں ایم اے، فلاسفی میں ایم اے، اردو میں بی اے اور فارسی میں انٹر کیا تھا۔ اکثر پروگراموں میں وہ شریک رہے۔ خصوصاً جماعت کے مرکزی قائد سید حامد حسین صاحب کے مورانواں آمد کے موقع پر۔

جیل میں مختلف عنوانات پر سمپوزیم بھی ہوتے رہے۔ غیر مسلم تنظیموں والے تعجب کا اظہار کرتے تھے کہ جماعت اسلامی والے کتنے فعال، اصول پسند اور نیک اخلاق کے حامل ہیں۔ رام چندر ایڈوکیٹ اناؤ نے کہا کہ بھائی جماعت اسلامی کے لوگ جو بھی گفتگو کرتے ہیں وہ قرآن اور حدیث پر مبنی ہوتی ہے۔ ایسے مسلمان ہمارے پڑوس میں نہیں پائے جاتے، باہر تو ایسے مسلمانوں سے سابقہ رہا ہے جن کے کردار سے وحشت ہوتی تھی۔

اسی درمیان ایک روز ایک دہشتناک واقعہ پیش آیا' مافیا لیڈر مناتیواری اور اسٹوڈنٹ لیڈر روج کو کسی طرح لوہے کی پتیاں مل گئیں، ان پر دھار بنائی گئی۔ ۱۶ نمبر بیرک میں داخل ہو کر انھوں نے گوکرن تیواری پر تابڑ توڑ حملہ کر دیا۔ بیرک کے دو تین لوگ بچانے کے لیے ان کی طرف بڑھے تو انہیں بھی زخمی کر دیا۔ سبھی لوگ دہشت زدہ ہو گئے۔ کمپاونڈ کے گیٹ وارڈر نے مخصوص وسل بجائی، پھر الارم بجا، تھوڑی دیر میں ہمارے کمپاؤنڈ میں جیلر' ڈپٹی جیلر' نمبر دار' جیل کی فورس پٹ پڑی۔ جیل آفیسروں سے ذمہ داروں نے الگ لے جا کر بات کی، شرما جی نے کہا کہ بس عافیت اسی میں ہے کہ ان لوگوں کو یہاں سے الگ کر دیا جائے چناں چہ ان دونوں کو ہماری بیرکوں سے منتقل کر دیا گیا۔ دراصل تنازعہ میس کا تھا۔ میس کا نظم آر ایس ایس والوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ان کے خلاف شکایت تھی کہ یہ لوگ کھانا دینے میں تفریق برتتے ہیں۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک روز میرے بڑے بھائی محمد یامین خاں صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ ملاقات ڈپٹی جیلر کی موجودگی میں ہوتی تھی۔ بھائی صاحب نے ایک تحریر کردہ درخواست دی کہ آپ اس پر دستخط کر دیں۔ اس میں لکھا تھا کہ ہمارا جماعت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بھائی صاحب نے بتایا کہ والدہ محترمہ روتے روتے اپنی

بینائی کمزور اور صحت برباد کر چکی ہیں، والد صاحب بھی پریشان ہیں۔ ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب کی تجویز پر یہ درخواست لے کر آیا ہوں، انھوں نے کہا ہے کہ منظور صاحب اس درخواست پر دستخط کر دیں تو میں ان کو رہا کرالوں گا۔ میں نے کہا کہ کیا میں مجرم ہوں کہ معافی مانگوں؟ دین اسلام پر عمل کرنے کی خاطر مجھے بے گناہ جیل میں ڈالا گیا ہے، میں ہرگز دستخط نہیں کروں گا۔ میرے اس جملہ سے بھائی صاحب مایوس ہو کر لوٹ گئے۔

ہمارے غیر مسلم دوست اپنے تیوہاروں میں ہمیں کھانے کی دعوتوں میں شریک کرتے اور ہم جماعت اسلامی والے بھی اپنے غیر مسلم بھائیوں کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر سیویوں پر مدعو کرتے تھے۔

تقریباً ۴ بجے روزانہ چائے کا دور چلتا تھا۔ ایک دن میس کے ذمہ دار نے سب کو چائے دی مگر ہمیں نہیں دی۔ شرما جی کے پاس جب چائے آئی تو کہا کہ ان لوگوں کو چائے کیوں نہیں دی گئی؟ بتایا کہ چائے ختم ہوگئی، تو اسی وقت سے شرما جی نے چائے لینا بند کر دی۔ جب جیل سے نکلنے کے بعد ملاقات ہوئی اور چائے پیش کی تو فرمایا منظور صاحب، اسی دن سے ہم نے چائے لینا بند کر دی تھی!

آر ایس ایس کی شاکھاؤں میں ایک گیت گایا جاتا تھا کہ ..... ایک دن راقم نے بانگر مؤ کے گپتا جی سے پوچھ ہی لیا، بھائی گپتا جی! دیش کے دُشٹ لوگ کون ہیں؟ ان کی خاموشی پر ہمیں نے جواب دیا کہ اس گیت کے مخاطب تو ہم مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں، یہ ذہنیت ٹھیک نہیں ہے۔ جب تک خدا چاہے ایک چیونٹی کو بھی کوئی مٹا نہیں سکتا کجا کہ مسلمانوں کو مٹایا جا سکے، یہ دیوانے کی بڑ نہیں تو اور کیا ہے؟ بے چارے خاموش ہو کر رہ گئے۔

جیل میں آئے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون سہارا تھا۔ اس ضمن میں قرآن پاک، حدیث رسولؐ اور نمازوں سے برابر مدد ملتی رہی۔ بزرگ ساتھی حکیم عماد الدین صاحب برابر صبر و شکر کی تلقین کیا کرتے تھے۔ دوسرے لوگ معافی کی درخواست دے دے کر رہا ہوتے رہتے تھے۔

میری اہلیہ مسلسل علیل رہا کرتی تھیں، اسی بنیاد پر ایک ماہ کے پیرول پر راقم جیل

سے باہر آیا۔ اعزہ نے مکمل رہائی کے لیے عدالت میں بیل کے لیے اپلائی کردی۔ ضمانت کے دن عدالت کے باہر پولیس کا زبردست ہجوم تھا۔ اس وقت شہر اناؤ کے کوتوال کرپال سنگھ کے ظلم و بربریت کا طوطی بول رہا تھا۔ ہمارے گھر والوں اور ہمارے وکیل سے یہ کہا گیا کہ سب لوگوں کو جیل میں بند کردیا جائے گا۔ ضمانت دار ہمارے دونوں چھوٹے بھائی تھے۔ مارے خوف کے سبھی لوگ سہم گئے۔ ضمانت تو کیا ہوتی، جیل میں پھر اسی جگہ پہنچا دیا گیا۔ رات میں مورخہ ۱۶ر فروری ۱۹۷۶ء کو میسا لگائے جانے کا آرڈر تھما دیا گیا:

داد دیجے کہ ہم جی رہے ہیں وہاں
ہیں محافظ جہاں قاتلوں کی طرح

آہستہ آہستہ ۲۲ ماہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق اور اس کی عنایت سے استقامت کے ساتھ کٹ گئے اور ۲۳ر مارچ ۱۹۷۷ء کو رہائی ہوگئی۔ باطل باطل ہوکر رہ گیا:

ہماری التجا کو آنسوؤں کو
ترستا رہ گیا قاتل ہمارا

اس موقع پر اگر ہم اپنے اہل خانہ کو بھول جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی بڑی ناشکری ہوگی۔ ایسے آزمائش کے ماحول میں ان حضرات نے بڑے ہی صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا، جس سے بڑی تقویت ملی۔ خصوصاً برادر عزیز حسین احمد خاں صاحب نے سرگرم رہ کر ہماری مدد کی۔ مقامی رفقا اور اس وقت کے ناظم علاقہ حافظ منصور عالم صاحب کی بھاگ دوڑ قابل رشک تھی۔ جیل میں محترم امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف صاحب کا خط بھی موصول ہوا، جس میں صبر واستقامت کی نصیحتیں تھیں۔

آخر میں خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ جب تک زندگی ہے اسلام پر قائم رہوں اور خاتمہ ایمان پر ہو۔ آمین:

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

انسان کے روپ میں دیوتا

□ محمد اشرف علی قاسمی
سرکڑہ ضلع بجنور (یوپی)

۲۶ رجون ۱۹۷۵ء کو میں ذاتی ضرورت سے مراد آباد گیا تھا۔ ناظمِ علاقہ مرحوم ارشاد حسین جعفری ابھی گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ رات مراد آباد کے رفقا بھی حوالۂ زنداں کر دیے گئے ہیں۔ پھر اسی روز ناظم جماعت اسلامی علاقہ میرٹھ کا خط آیا کہ مرکز کے کئی ذمہ داران بھی گرفتار ہو گئے ہیں۔ راقم الحروف سرکڑہ چکرا جمل کے مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیمی خدمات انجام دیتا تھا۔ یہ مدرسہ جماعت کی زیرنگرانی تھا۔ ۴ جولائی کو ابھی میں مدرسہ ہی میں موجود تھا کہ اطلاع ملی کہ نجیب آباد، شیرکوٹ، تاجپور، اور دھام پور کے رفقاے جماعت گرفتار ہو گئے ہیں۔ سالک دھام پوری میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ پولیس نے ان کے مکان پر اپنا ڈیرہ ڈال دیا ہے اور محلے والوں کو پریشان کر رہی ہے۔ میں ان کو لے کر تھانہ دھام پور گیا۔ حسن اتفاق سے راہ میں سی آئی ڈی والے مل گئے۔ بولے، مولانا صاحب! آپ سالک صاحب کو کہاں لیے پھر رہے ہیں، پولیس ان کے مکان پر پڑی ہوئی ہے، آپ دونوں تھانہ چلیں۔ ہم دونوں تھانہ گئے، ایس۔ ایچ۔ او صاحب سے ملے، بولے ٹھیک ہے سالک صاحب کو یہیں بٹھا دیں اور آپ جا سکتے ہیں۔ میں نے سالک صاحب کے یہاں جا کر پولیس والوں کو اطلاع دی کہ سالک صاحب تھانہ آ گئے ہیں، پولیس والے مطمئن ہوئے اور جب تھانہ سے بھی مزید اطلاع آ گئی تو وہاں سے چلے گئے۔ سالک صاحب کے بچوں کو اور ان کی والدہ محترمہ کو تسلی دی اور

سرکڑہ مدرسہ میں واپس آ گیا۔ بڑا پر آشوب دور تھا، جس کا آج تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ میں جہاں بھی جاتا سب تعجب سے کہتے، ارے! مولانا آپ باہر کیسے پھر رہے ہیں؟

ایک وکیل صاحب نے مشورہ دیا کہ ایک سال انڈر گراؤنڈ ہو جاؤ۔ ان کی ناپسندیدہ بات سن لی گئی اور بس۔ ۱۳ر جولائی کی شام کو بلیک بورڈ کے ذریعہ کوئی سوال طلباء کو سمجھا رہا تھا، اتنے میں داروغہ ڈھاکہ صاحب آئے، ان کے ساتھ چار سپاہی بھی تھے۔ رسمی سلام وکلام کے بعد بولے! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ میں نے مدرسہ کے رجسٹرس اور تالہ کنجی امام الدین انصاری مرحوم کے حوالے کیں۔ موصوف جماعت کے ہمدرد اور متفق تھے، انھوں نے مجھے خدا حافظ کہا۔ شام کے ۵ بجے ہوں گے ابھی عصر کی اذان نہیں ہوئی تھی کہ ہم پولیس والوں کے ساتھ سرکڑہ بستی سے گزر کر روڈ پر آ گئے۔ ایک جیپ کو ہاتھ دیا۔ جیپ رکی اور خالی کر دی گئی۔ پولیس والے مجھے لے کر دھام پور روانہ ہو گئے۔ دھام پور میں کئی جان پہچان کے لوگوں نے دیکھا۔ دور سے ہاتھ کے اشارہ سے سلام ہوا۔ اس طرح میری گرفتاری کی اطلاع دھام پور میں ہو گئی۔ تھانہ میں داخل ہوا۔ ایس۔ ایچ۔ او کے سامنے لایا گیا، نماز عصر ادا کی اور داروغہ کی طرف آیا تو سی آئی ڈی انسپکٹر آ گئے اور مجھے وہاں سے اپنے آفس میں لے آئے۔ یہ انسپکٹر جان پہچان کا آدمی تھا۔ اس نے بہت سارے سوالات کیے، جو ضروری سمجھا اس کا جواب دیا اور غیر ضروری پر معذرت کی۔ اس نے کہا ۷ بجے کے قریب آپ کو حوالات میں جانا ہے کیوں کہ باہر رکھنے کا انتظام نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا ٹھیک ہے آپ حوالات میں ایک بالٹی پانی رکھوا دیں اور مگا۔ میرے ساتھ ایک اور آدمی بھی حوالات میں آیا، کسی چوری یا مار پیٹ کا ملزم تھا۔ رات کو اس کی حوالات میں پٹائی بھی ہوئی۔ رات کو میرے مکان سیوہارہ سے ایک عزیز رشتہ دار کھانا لائے، کچھ کھانا کھایا، باقی بچا ہوا کھانا صبح کے لیے رکھ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رشتہ دار رخصت ہو گئے۔ میں لیٹ گیا۔ رات کے پچھلے حصہ میں اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اذان ہو گئی تو نماز فجر ادا کی اور قرآن مجید زبانی پڑھتا

رہا۔ اتنے میں دھام پور قصبہ کے ایک معروف لیڈر جناب تقی الدین صاحب آئے جو بڑے خلیق اور بامروت آدمی تھے، جماعت اسلامی اور سالک صاحب کے تعلق سے مجھ سے واقف تھے۔ مجھے تسلی دی اور فرمایا کہ ابھی آپ کے لیے چائے بھیج رہا ہوں۔ میں نے منع کیا مگر وہ نہ مانے چائے بھجوادی۔ رات کے بچے کھانے اور چائے سے بحمد اللہ ناشہ ہو گیا۔ بجنور جیل کے لیے ۱۰ بجے چالان ہوا۔ پیدل دو پولیس والوں کے حوالے کیا گیا۔ بس اسٹینڈ کافی دور تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنے رب کو یاد کر رہا تھا۔ بارِالٰہا! میرے ایمان اور صبر و ثبات کے ان لمحات کو سیّات کا کفارہ بنادے! اسے اپنی راہ میں قبول فرما۔

ہم چل رہے تھے۔ راہ گیر اور دوسرے دیکھنے والے آوازیں کس رہے تھے، شاید یہ خیال کر کے کہ داڑھی والے ملّا نے کوئی بڑا کانڈ کیا ہوگا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ ان مولانا نے نس بندی کی مخالفت کی ہوگی اور کسی نے کہا ارے بھئی ایمرجنسی لگ گئی ہے اس لیے مولانا صاحب کو پکڑ لائے ہیں وغیرہ، جتنے منہ اتنی باتیں۔ اسی دوران میں میرے والد صاحب اور دیگر رشتہ دار آئے۔ سرسری ملاقات ہوئی۔ والد صاحب نے صبر اور شکر کی تلقین اور ''سورۃ واقعہ'' پڑھنے کی تاکید کی۔ روانگی ہوئی، مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تو وہ بولے کہ ان کو کیوں باندھ رکھا ہے؟ ہمارا ہتھکڑی لگانے کا آرڈر نہیں ہے۔ یہ سن کر پولیس والوں نے ہتھکڑی کھول دی اور جیل پہنچا دیا۔ گیٹ کیپر بڑا ترش رو تھا، اس نے تلاشی لی اور برہنہ ہونے کو کہا، میں سختی سے بولا کیا بدتمیزی کرتے ہو، جانتے نہیں ہو میں میسا بندی اور سیاسی لیڈر ہوں، چند سکوں کے لیے پریشان کرتے ہو، میں بولتا ہی چلا گیا اتنے میں جیلر صاحب آئے اور بولے کہ مولانا صاحب سر کھشا بندی ہیں مجرم یا ملزم نہیں۔ ان سے کچھ نہ کہو جو کچھ ان کے پاس تھا وہ دفتر میں جمع کر آئے ہیں۔ آؤ مولانا یہاں بیٹھو۔ وہ دفتر کے برآمدہ میں لے گئے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ میرے آنے کی اطلاع میرے رفقا کو بھی ہو گئی تھی۔ جیل کے اندر ہل چل مچ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے پاس محمد یعقوب نامی ایک حوالاتی آیا اور اس نے سب حالات معلوم کیے۔ بولا کہ میرا تعلق بھی سیوہارہ سے ہے، آپ جیلر سے کہنا

کہ مجھے بیرک ۵ میں بھیج دیں کیوں کہ میرے یہاں کے بابو محمد یعقوب ہیں ان سے مجھے راحت اور آسانی ملے گی، چناں چہ میں نے یہ بات جیلر سے کہہ دی، جیلر نے مجھے بیرک ۵ میں ہی بھیجنے کی اجازت دے دی۔ جناب عقیل الدین مرحوم الاستاذ شفقت اللہ خاں نجیب آبادی' سالک دھام پوری وغیرہ نے جو وہاں پہلے سے موجود تھے جیل آنے کی مبارک باد دی۔ میری عجیب حالت تھی۔ اپنے جماعتی رفقا کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ ہم کسی ضلعی اجتماع میں آئے ہیں۔ ساری تکان رفقا کو دیکھ کر دور ہوگئی۔ اب بیرک ۵ میں داخل ہوا۔ اس بیرک میں سب حوالاتی جرائم پیشہ لوگ تھے، میسا بندی صرف میں اور الاستاذ ماسٹر شفقت اللہ مرحوم تھے۔ جان پہچان کے آدمیوں میں محمد یعقوب نامی شخص سیوہارہ کے ملے جو جیل کے دروازہ پر بھی ملے تھے۔ میری بڑی خدمت کی۔ کہیں سے کچا آم لائے اور نمک مرچ فراہم کر کے چٹنی بنائی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ استاذ مرحوم ماسٹر شفقت اللہ خاں اور یعقوب صاحب نے مجھے جیل کا احساس نہ ہونے دیا۔ معلوم نہیں جیل کے کیا اصول تھے کہ صبح کو ہمیں بھی اپنا سامان لے کر پریڈ میں کھڑا کرتے تھے، تھوڑی دیر میں چنے یا دلیہ دے کر ہمیں اندر جانے کا حکم ہوتا تھا، باقی قیدی کام پر لگا دئے جاتے تھے۔ ہفتہ عشرہ کے بعد کچھ اور رفقاے جماعت بھی آگئے۔ عام قیدی بے چارے جماعت سے تو کیا اسلام سے بھی واقف نہ تھے مگر اب حوالاتی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔ ۲۰ر جولائی کے بعد جن سنگھ اور آر ایس ایس کے اور ایک دو ہندو پریشد کے لوگ آگئے۔ اس بیرک سے اخلاقی قیدیوں کو رخصت کر دیا گیا، اور صرف سیاسی ہی رہ گئے، مگر رہے ہم سب سی کلاس میں ہی۔ آٹے میں ریت، دال میں کنکڑیاں، سبزیاں بغیر دھلی لمبی لمبی کٹی ہوئی، اب سمجھ میں آتی کہ جیل کی روٹی کیسی ہوتی ہے۔ چائے' دودھ' پھل کا تو تصور ہی نہیں۔ ناشتہ میں ادھ بھنے چنے کمزور دانتوں والا لے کر کیا کرے؟ دلیہ کا کبھی پانی الگ اور کبھی دانے الگ، کس کی مجال کہ احتجاج کر سکے، ہر وقت احتساب کا اندیشہ۔ اسی درمیان دھام پور تھانہ سے چارج شیٹ آئی جو فرضی اور بالکل ہی غلط تھی۔ مجھے

ایک گاؤں میں پارٹی کی میٹنگ کرتے اور یہ تقریر کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ اندرا نے ایمرجنسی بالکل غلط لگائی ہے، ہم اس کو ہرگز نہیں چلنے دیں گے۔ ریلوے لائن اکھیڑ دیں گے، بجلی پانی کی سپلائی بند کر دیں گے، تحصیل تھانہ میں آگ لگا دیں گے، ہندو مسلم بلوے کرائیں گے۔ میری چارج شیٹ ڈی آئی آر کے تحت تھی، ابھی میسا نہیں لگا تھا، میسا اس وقت لگا جب میں نے اور میرے چند ساتھیوں نے ضمانت کرالی۔ ڈی آئی آر کے تحت مقدمہ بھی جیل میں چلا۔ ہر ہفتہ مجسٹریٹ آتے اور بیان لیتے۔ غرض یہ کہ خوب ڈرامہ بازی ہوئی۔ سی آئی ڈی والوں کی طرف سے ترغیب و ترہیب کا سلسلہ جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل ہے کہ اس نے استقامت عطا فرمائی۔ بجنور جیل میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں عیدیں گزریں۔ ہم دس آدمی جماعت کے ارکان میں تھے اور دو غیر جماعتی مسلمان تھے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جیل میں نقص تغذیہ اور گندگی کی وجہ سے انلفلوئنزا پھوٹ پڑا، ہم نے اپنے غیر مسلم ساتھیوں کی وہ خدمت کی جسے وہ آج تک یاد کرتے ہیں۔ جو بھی ہم سے ہو سکا ہم نے اللہ کی رضا کی خاطر متاثرین کی دیکھ بھال کی۔ ماسٹر عقیل الدین صاحب، ماسٹر شفقت اللہ صاحب کی خدمات نمایاں تھیں۔ جیل کے اسپتال سے دوائیں، انجکشن لاتے اور مریضوں کو دیتے۔ مریض شفایاب ہونے پر جگہ جگہ چرچا کرتے، کہتے کہ بھئی جماعت اسلامی والے انسان کے روپ میں دیوتا ہیں، ان میں ذرا بھی بھید بھاؤ نہیں، ایک امرود بھی کہیں سے آتا ہے تو اس کی ذرا ذرا سی قاشیں بنا کر سب مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ پوری بیرک میں بڑا اتفاق اور اتحاد تھا۔ ایسی اجتماعیت اگر قائم ہو جائے تو ہندستان واقعی جنت نشاں بن سکتا ہے۔

اسی درمیان طے پایا کہ جیل سے سامان رسد لے کر خود اپنی نگرانی میں کھانا تیار کرایا جائے اور تقسیم کرایا جائے۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد سپرنٹنڈنٹ صاحب اور جیلر نے یہ معقول بات مان لی۔ بیرک ۵ کے لوگوں کے لیے کھانا علٰحدہ تیار ہونے لگا۔ سب ساتھیوں کی روزانہ علٰیحدہ علٰیحدہ کاموں کی ڈیوٹی لگتی تھی۔ ماشاء اللہ اسی رسد سے عمدہ کھانا

تیار ہونے لگا کہ ہمارا بریلی کے لیے ٹرانسفر ہوگیا۔ ۶ ردسمبر ۱۹۷۵ء کی ٹھنڈی رات، سی کلاس کے قیدی، بہت زیادہ زحمت اور پریشانی ہوئی۔ تلاشی کے بعد کال کوٹھریوں میں بند کردیا گیا جہاں سے ہم اگلے دن ۲ ربجے نکالے گئے۔ صبح کو نماز کے لیے وضو کا پانی میسر نہ تھا، تیمّم سے نماز پڑھی۔

دفتر جیل میں حاضری کے بعد ایک ایسے بیرک میں بھیجا گیا جہاں سب جرائم پیشہ لوگ تھے۔ دوپہر کا کھانا وہیں آیا، کھانا کھا کر ماسٹر عقیل الدین صاحب باہر نکلے، ڈاکٹر صابر علی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف نے وعدہ کیا کہ ابھی متبادل اچھا انتظام کرواتے ہیں۔ موصوف نے جا کر اپنے بیرک میں جن سنگھ اور آر ایس ایس کے لوگوں کو بتایا کہ جماعت کے لوگوں کو بجنور جیل سے بھیجا گیا ہے، ان کے لیے کچھ ضرور ہونا چاہئے۔ انھوں نے یہ سنا تو وہ سب بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے کہ جب تک بجنوری ساتھی یہاں نہیں آئیں گے ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ زبردست احتجاج کو دیکھ کر بالآخر جیلر کو اپنی حرکت پر نادم ہونا پڑا اور مجبوراً اس بیرک سے ہمیں سرکل ۴ بیرک ۴ بھجوایا۔ جب ہمارا کارواں وہاں پہنچا تو سرکل ۴ والوں نے ہمارا استقبال کیا اور گرمجوشی سے ملے۔ کئی مہینوں تک اپنے کھانے پینے میں شریک رکھا۔ یہاں بھی ہم سی کلاس میں تھے، ہمیں وہاں ہر چیز برابر برابر ملتی تھی۔ یہاں صحت بھی ٹھیک رہی۔ غالبًا تین ماہ کے بعد بجنور سے اطلاع ملی کہ ہمیں سپر یر کلاس مل گئی۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ ایک ماہ کے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے ضلع بلند شہر کے رفقا بشمول برادر عبد الجبار کریمی صاحب آئے ہیں اور سرکل ۳ میں قیام ہے، بڑی خوشی ہوئی، عبد الجبار کریمی کا کیا کہنا! بڑی ہی گرمجوشی سے ملے۔ سبحان اللہ مکمل ہندستانی، مگر دیکھنے میں بالکل بنگلہ دیشی لگتے ہیں۔ پھر ایک روز معلوم ہوا کہ محترم سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب اور مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب بھی آگئے ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی۔ ایک دن یہ سب رفقائے کرام ہم سے ملاقات کے لیے آئے۔ آہ!

وہ آئے گھر پہ ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

جناب مشتاق احمد سالک دھامپوری مہمانوں کا استقبال کرنے میں پیش پیش تھے۔ غیر مسلم ساتھیوں نے بھی بہت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ کافی دیر تک یہ حضرات ہمارے ساتھ رہے۔ ہم صبح ۱۰ بجے مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کے درس میں شرکت کے لیے سرکل ۳ جاتے تھے۔ چناں چہ ہم لوگ راضی خوشی وہاں سے سرکل ۳ مولانا صاحبان کے پاس آگئے۔ صبح دس بجے روزانہ درس قرآن مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب دیتے تھے۔ یہ زعماء میری بہت رعایت رکھتے تھے۔ مولانا ابواللیث صاحب تو مجھے روزانہ بیڈمنٹن کا کھیل سکھاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ دونوں صاحبان کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین

ایک لطیفہ پر یہ یادیں ختم کرتا ہوں۔ ایک دن کا ذکر ہے، خربوزوں اور تربوزوں کا موسم تھا۔ شاید برادرم عطاء الرحمٰن وجدی نے کہا کہ مولانا تربوز جیل میں کیوں نہیں آسکتا؟ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب نے فرمایا ارے بھائی جیل میں منافق کیسے آسکتا ہے؟ تربوز منافق جو ٹھہرا، باہر سے ہرا اور اندر سے لال! سبحان اللہ۔ اب یہ یادیں ہی رہ گئی ہیں، تقریباً سب ہی دارِ آخرت کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سات سال کی سزا

□ اکبر حسن
اعظم گڑھ (یوپی)

میں بھی ایمرجنسی میں گرفتار ہوا تھا اور اعظم گڑھ جیل میں تھا، جہاں مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب مرحوم اور مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب مرحوم بھی تھے۔ ان حضرات کی کوشش تھی کہ تمام سیاسی قیدیوں سے ربط قائم کر کے ان کے خیالات ونظریات سمجھے جائیں۔ چناں چہ روزانہ ایک گھنٹہ کی نشست ہوتی تھی اور اس میں لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ دوسرے بیرکوں میں ڈکیتی وچوری کے غلط اثرات اور اس کے برے نتائج کو سمجھایا جاتا تھا اور یہ بتایا جاتا تھا کہ تم لوگ اپنی غلط حرکتوں کی وجہ سے پولیس اور سماج کی نظروں میں گرے ہوئے ہو۔ رکشہ چلا کر یا محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے تو اس سے کہیں زیادہ بہتر رہتے۔

ایک خیال یہ ہوا کہ ہندی پڑھی اور سیکھی جائے، لہٰذا اس طرح اچھی خاصی ہندی ہم لوگوں نے سیکھ لی۔ کچھ لوگوں نے کلام پاک کی کچھ سورتوں کو حفظ کرنے کی کوشش کی۔ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب مرحوم قرآن کی تفہیم کے لیے ایک گھنٹہ درس قرآن دیتے تھے جس سے کافی فائدہ ہوا۔

اس طرح پانچ ماہ کی مدت گزری اور ہمارا مقدمہ شروع ہوگیا۔ مولانا ابواللیث صاحب مرحوم کی ضمانت ہوئی اور دوسرے دن میسا لگ گیا۔ اسی طرح مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب مرحوم کی بھی ضمانت ہوئی اور پھر میسا کے تحت گرفتار ہوگئے۔ لوگوں کی ضمانتیں

ہوتی رہیں۔ جب میرا مقدمہ پیش ہوا تو عدالت نے مجھ سے معافی مانگنے کو کہا تو میرا جواب تھا کہ عدالت کو فریق نہیں ہونا چاہیے۔ عدالت کی نظر میں مجرم اگر قصوروار ہے تو سزا ملنی چاہیے ورنہ اسے بری کر دینا چاہیے۔ اس پر خفا ہو کر جج نے مجھے سات سال کی سزا سنائی۔ میں نے اپیل کی تو سات سال کی سزا ختم کر کے ایک سال کر دی گئی۔ اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ جیل میں مولانا ابو اللیث صاحب مرحوم اور مولانا صدر الدین صاحب کی صحت خراب ہوگئی۔ مولانا ابولیث صاحب کو بواسیر کی شکایت تھی اور صدر الدین صاحب کو پیچش ہوگئی تھی۔ اسی دوران ایک دن مغرب سے کچھ پہلے جیلر صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ ان دونوں کا ٹرانسفر فتح گڑھ جیل کے لیے کر دیا گیا ہے، آٹھ بجے رات میں جانا ہے۔ میں نے جیلر صاحب سے کہا کہ ان لوگوں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ سفر کے لائق نہیں ہیں۔ حالت سدھر جانے پر ٹرانسفر کیا جا سکتا ہے لیکن جیلر صاحب نے کہا کہ کسی طور پر ٹرانسفر تو نہیں رکے گا۔ البتہ میں چارپائی کا انتظام کر دیتا ہوں۔ چارپائی ٹریکٹر پر رکھ دی جائے گی۔ شاہ گنج تک جائیں گے۔ شاہ گنج سے ریلوے ریزرویشن ہے۔ ان کے ساتھ مسعود صاحب کا بھی ریزرویشن ہے، مسعود صاحب لے کر جائیں گے، کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ مجبوراً میں نے مولانا سے کہا۔ مولانا نے فرمایا میرا بستر وغیرہ ٹھیک کرو اللہ سفر آسان کرے گا۔ مسعود صاحب نے بھی مجھے تسلی دی کہ میں ساتھ میں ہوں۔ مولانا کا سامان وغیرہ ٹھیک کیا، باہر سے ناشتہ منگوا کر دیا کہ صبح میں پریشانی نہ ہو۔ اس وقت جیل میں سبھی کی ضمانت ہوگئی تھی، صرف چار پانچ لوگ تھے۔ مولانا کو رخصت کرنے کے بعد جیل میں سناٹا ہوگیا۔

جیسا کے اوپر ذکر کیا جا چکا ہے سیشن جج نے مجھے سات سال کی سزا سنائی تھی۔ ٹھیک ایک ماہ بعد ایک شخص سے سات ہزار روپیہ رشوت لیا مگر اس کا کام نہیں ہوا، عدالت میں اس نے سات جوتے سیشن جج کے سر پر لگائے۔ اس سے پوری کچہری میں ہنگامہ ہوگیا۔ میرے وکیل سردھنی سنگھ کچہری کے گیٹ پر کھڑے تھے، میں اپنی ضرورت سے جا رہا تھا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وکلا کے سامنے لے گئے اور کہا کہ یہی وہ مولانا صاحب ہیں جن کو سات سال سزا سنائی گئی تھی!

❁❁

غیر مسلموں کی حق پرستی

□ مظہر الحسن خاں
ککرالہ، ضلع بدایوں (یو۔پی)

میں مظہر الحسن خاں ساکن موضع ارولیہ ککرالہ ضلع بدایوں یوپی کا رہنے والا ہوں۔ ۱۶ر جولائی ۱۹۷۵ء کو شام ۹:۳۰ بجے مجھے گرفتار کیا گیا اور ۱۷ر جولائی کو گیارہ بجے بدایوں ہتھکڑی ڈال کر جیل لے جایا گیا۔ ۱۷ر جولائی ۷۵ء سے اکتوبر ۷۵ء تک جیل میں رہا۔

تفصیل اس طرح ہے کہ میں عشا کی نماز کے لیے گیا کہ بارش ہونے لگی۔ ادھر پولیس والے مکان پر آ گئے اور گھر میں گھس گئے۔ گاؤں کے سبھی لوگ میرے ہمدرد تھے۔ ستر اسی آدمی جمع ہو گئے۔ میری بیوی اور بہن گھر پر موجود تھیں۔ بارش کی وجہ سے میں عشاء کی نماز کے بعد اپنے رفیق سلیمان خاں صاحب کے گھر پر ٹھہر گیا۔ سوچا بارش رک جائے تو گھر جائیں۔ ادھر گاؤں والے پولیس والوں سے کہتے رہے کہ ہمیں لے چلیں لیکن وہ لوگ بیوی اور بہن دونوں کو ۲ کلومیٹر دور ککرالہ پولیس چوکی لے گئے، ساتھ میں میرے بھائی، بہنوئی اور گاؤں کے ستر اسی کے قریب لوگ بھی چوکی پر گئے۔ بارش بند ہونے پر میں گھر گیا۔ گھر میں تالے لگے تھے، معلومات کر کے میں فوراً ککرالہ گیا۔ میرے ساتھ بھی لوگوں کی کافی تعداد تھی۔ تھانے دار نے مجھے بٹھالیا اور مجھ سے معلومات حاصل کیں اور بیوی و بہن دونوں کو جانے کی اجازت دے دی جو میرے عزیزوں کے ساتھ واپس گھر چلی گئیں۔ مجھے اعلیٰ پور تھانے میں لے جا کر بند کر دیا۔ صبح کو ۹:۳۰ بجے میرے خلاف پولیس والوں نے بے بنیاد اور قطعی جھوٹی تحریر پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ گرفتاری کے وقت اپنے مکان کے

سامنے لوگوں کو جمع کر کے جن کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی، تقریر کر رہے تھے اور حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ قریب گیارہ بجے مجھے بدایوں لے جایا گیا اور جیل میں داخل کر دیا گیا۔

میں اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا، اسکول سے مجھے معطل کر دیا گیا اور تنخواہ بند کر دی گئی۔

میرے خلاف مقدمہ چلتا رہا، جیل سے باہر آ جانے کے بعد بھی جس کا سلسلہ جاری رہا۔ میرے خلاف اردلیہ کے تین غیر مسلم گواہ پولیس نے بنائے تھے:

۱۔ کہنی لال

۲۔ ایشوری

۳۔ اتواری لال

پولیس نے ان پر دباؤ ڈالا، مارا پیٹا اور پکڑ کر ایس پی صاحب کے یہاں لے گئے، انھوں نے بھی دھمکایا پھر بھی یہ گواہی دینے کو تیار نہیں ہوئے۔ اس کے بعد پولیس انھیں جیل کے پھاٹک پر لے گئی اور کہا کہ گواہی دو ورنہ ہم تمھیں ابھی جیل میں بند کر دیں گے لیکن اُن تینوں نے کہا کہ ہمیں چاہے قتل کر دو، قتل ہونا منظور ہے لیکن جھوٹی گواہی دینا منظور نہیں۔ پولیس والوں نے انھیں گالیاں دیں، پٹائی کی لیکن وہ گواہی دینے کو (یعنی جھوٹی گواہی دینے کو) تیار نہیں ہوئے، بلکہ پولیس سے چھپ کر انھوں نے عدالت میں بیان حلفی داخل کر دیا جس کی وجہ سے ہماری ضمانت منظور ہوگئی اور ہم جیل سے باہر آ گئے۔

.....للہ رب العالمین

❑ محمد حسین اسلمی
بھیونڈی ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

جماعت اسلامی ہند پر ایمرجنسی کا عتاب نازل ہوا تو مجھے بھی گرفتار کیا گیا۔

رات کے آخری حصہ میں مجھے پونہ ایروڈہ جیل میں داخل کیا گیا۔ جیل والوں کو غالباً پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ جماعت اسلامی ہند بھیونڈی کے امیر اور پونہ ڈیویژن کے ناظم کو گرفتار کر کے لایا جا رہا ہے۔ جیل میں داخل ہوتے ہی ایک بھیڑ سی نظر آئی۔ معلوم ہوا یہ سب آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ کے لوگ ہیں۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ان کے ذہن میں میرا جو حلیہ تھا وہ اس طرح تھا کہ میری صورت بہت خطرناک ہوگی، الجھے ہوئے بال ہوں گے، آنکھیں سرخ ہوں گی، ڈیل ڈول بھاری بھرکم ہوگا۔ اندر جا کر جب جن سنگھ کے لوگوں سے میل جول ہوا، تو مجھ سے واقف ہو کر خود بتانے لگے کہ آپ کے اندر آنے سے پہلے ہم آپ کے بارے میں ایسا ایسا تصور کیے ہوئے تھے۔ ان سے دعوتی ربط شروع ہوا۔ وہ بہت غور سے میری باتوں کو سنتے تھے۔

جلگاؤں، جامنیر اور بھساول کے رفقا وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ اذان اور نماز کا نظم قائم کیا گیا۔ جن سنگھ کے لوگ دور جمع ہو کر اذان کو غور سے سنتے اور نمازوں کو دیکھتے۔ ملاقاتوں میں میں نے ان کو اذان اور نماز کا مطلب سمجھایا۔ فجر کے بعد درس قرآن اور عصر کے بعد درس حدیث ہوتا تھا جس میں وہ بھی شریک ہوتے تھے۔ آر۔ ایس۔ ایس کے سرسنگھ چالک بالا صاحب دیورس بھی جیل میں تھے۔ ان کے ساتھ پونہ کے سنگھ چالک

بابا صاحب بھڑے بھی تھے۔ دو تین دن گزرنے کے بعد میں نے دونوں کو چائے پر بلایا۔ وہ آئے، گفتگو شروع ہوئی، اسلام، مسلمانوں اور جماعت اسلامی ہند کے تعلق سے بہت سارے سوالات کیے جن کا تسلی بخش جواب دیا گیا۔ اس نشست کے بعد دیورس صاحب قریب ہوئے۔ وہ دونوں سہ پہر کے وقت جیل میں تفریح کیا کرتے تھے۔ ایک جن سنگھی نے بتایا کہ ہم دیورس صاحب سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کر سکتے، آپ نے کیا جادو کیا کہ آپ کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔

چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ دیورس صاحب کی ۶۴ ویں سال گرہ منائی جانے والی ہے۔ دیورس صاحب نے جن سنگھ کے کارکنوں سے تاکیداً کہا کہ اسلمی صاحب کو بولنے کا موقع دیا جائے اور مجھے بھی اطلاع دی گئی۔ میں سوچتا رہا کہ کیا بولوں؟ میں نے گھر سے ہندی قرآن مجید منگایا۔ جیل میں اسٹیج بنا۔ اسٹیج پر دیورس صاحب کے ساتھ مجھے بھی بٹھایا گیا۔ سامنے تقریباً پانچ سو آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ کے کارکن بیٹھے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مدد فرمائی اور میں نے آیت کریمہ ان صلوتی و نسکی و محیایا و مماتی للہ رب العالمین کو بنیاد بنا کر تقریر کی۔ باتیں تو ان کے عقیدے کے خلاف تھیں لیکن غور سے سنی گئیں۔ اختتام پر میں نے قرآن پاک کا ہندی ترجمہ دیورس صاحب کو پیش کیا۔ انھوں نے قرآن کو کھڑے ہو کر نہایت ادب سے ہاتھ میں لیا، چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد جن سنگھ کے کارکنوں نے جلسہ گاہ ہی میں مبارکباد دی۔ رفقا کی تربیت کا کام جاری رہا۔ اس سے قبل مجھے ۱۹۶۵ء میں بھی گرفتار کیا گیا تھا اور Distt. Prison Thane میں بند کیا گیا تھا۔ جیل کے ایام میں رمضان اور عید گزری۔ جیل ہی میں عید کی نماز پڑھائی اور خطبہ دیا۔ ۱۹۷۵ء میں پونہ کی ایروڈہ جیل میں عید قرباں گزری اور دیوالی بھی۔ جب Release Order آیا اور میں سامان جمع کرنے لگا تو دیورس صاحب آئے اور انھوں نے منہ میں لڈو ڈالا اور مجھے گلے لگایا۔ کچھ دنوں بعد دیورس صاحب بھی رہا ہو گئے تھے۔ رہائی کے بعد انھوں نے کئی مقامات پر Public Meeting کو خطاب کیا۔ شیواجی پارک ممبئی، پونہ اور جمشید پور میں انھوں نے کہا کہ

جماعت اسلامی کے پونہ ڈویژن کے Organiser اسلمی صاحب جیل میں میرے ساتھ تھے۔ ان سے بات چیت ہوتی تھی۔ ہماری بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ پونہ ایروڈہ جیل میں چار مہینہ بند رہے۔

رہائی کے وقت مجھ سے ایک کاغذ پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا لکھا ہے؟ جیلر نے بتایا کہ یہ Undertaking ہے اس پر لکھا ہوا ہے کہ تم باہر جا کر کوئی ایسا کام نہ کرو گے جو حکومت کے لیے قابل اعتراض ہو۔ میں نے کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایسے کام کرتے تھے، اسی لیے حکومت نے ہم کو بند کیا تھا! میں نے کہا کہ ہم نہ پہلے کوئی ایسا کام کرتے تھے اور نہ آئندہ کریں گے۔ ہم تو سارے انسانوں کو امن اور بھلائی کی طرف بلاتے ہیں اور انھیں رب العالمین کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔ رہا کرنا ہے تو کیجیے ورنہ میں جیل ہی میں اچھا ہوں۔ یہ کہہ کر میں جیلر کے آفس سے نکل کر اپنی جگہ پر آ گیا۔ مجھے پھر بلایا گیا، پھر بلایا گیا۔ ہر بار میں نے انکار کیا۔ آخر کار بغیر دستخط کے رہا کر دیا گیا۔ فرسٹ کلاس ٹکٹ دیا اور ایک سپاہی کے ہمراہ مجھے پونہ اسٹیشن تک پہنچایا گیا۔ جب میں گاڑی میں سوار ہوا تو سپاہی چلا گیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ہمیشہ ساتھ رہی۔ اسی نے استقامت بخشی اور آزمائشوں سے بحفاظت گزارا۔ یہ اسی کا احسان ہے اور اسی کا فضل وکرم ہے۔

رہائی کے بعد ایک موقع پر آر۔ایس۔ایس کے پروگرام میں دیورس صاحب واڑہ آئے۔ واڑہ بھیونڈی کے قریب ایک مقام ہے۔ بھیونڈی کے سنگھ چالک جوگلکیر میرے پاس آئے اور کہا کہ دیورس صاحب واڑہ آئے ہیں اور انھوں نے آپ کو ملنے کے لیے بلایا ہے، میں گاڑی لے کر آیا ہوں آپ چلیے۔ میں نے جا کر ملاقات کی، بہت خوش ہوئے۔ خیر خیریت پوچھی۔ شام تک میں ان کے ساتھ پروگرام میں شریک رہا۔ پھر مجھے گھر واپس پہنچایا گیا۔ پونہ کے سنگھ چالک باباصاحب بھڈے بھیونڈی آئے تھے۔ آر۔ایس۔ایس کا کیمپ لگا تھا۔ مجھے ملنے کے لیے بلایا گیا، میں نے جا کر ملاقات کی اور قرآن کے نسخے مراٹھی زبان میں کئی ذمہ داروں کو پیش کیے۔

جنوری ۱۹۹۹ء میں مجھے مہاراشٹر حکومت نے ''سمان پتر'' دیا۔ ایمرجنسی کے خلاف احتجاج کیا اور جیل بھی گئے جس کے سلسلہ میں یہ اعزاز بخشا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اور اسی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے ناچیز بندوں کو اقامت دین کی راہ میں جدوجہد کرنے کی توفیق عطا کی۔

میدان مارلیا

غلام رسول دیش مکھ
بھساول (مہاراشٹر)

وہ ۲۶ر جون ۱۹۷۵ء کی شب تھی جب ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کا اعلان کیا گیا اور ایک ہفتے کے بعد ۳ر جولائی کی شب آر۔ایس۔ایس کے ساتھ جماعت اسلامی ہند کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔اس کے بعد ارکان وکارکنان جماعت کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔

۴ر جولائی کو بعد نماز جمعہ بمقام بھساول میں اپنے گھر پر ہی موجود تھا کہ اچانک پولیس آگئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ ''چلیے! آپ کو صاحب نے پولیس اسٹیشن بلایا ہے۔ میں نے وضاحت چاہی کیا بستر اور بیگ ساتھ لے لوں؟''— ''نہیں، بعد میں وقتِ ضرورت منگوالینا'' مجھے جواب ملا۔ پھر میں نے اہلیہ سے کہا کہ مجھے گرفتاری کے لیے پولیس اسٹیشن بلوایا گیا ہے اور میں جارہا ہوں۔ پولیس کے ساتھ چل دیا۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے پر پتہ چلا کہ جماعت کے چار کارکنوں کے علاوہ ایک اور صاحب کو بھی جو جوا اور سٹہ کا کاروبار چلاتے تھے اور کانگریس کے ممبر تھے جماعت کے نام پر لے آیا گیا تھا۔ گرفتار شدگان میں آر۔ایس۔ایس کے ایک ہی صاحب تھے، جب کہ اس تنظیم کے ممبران کی تعداد بھساول میں کم وبیش ایک ہزار ہوگی۔

مقامی امیر عبدالرزاق صاحب اس وقت گھر پر نہیں تھے، بعد میں معلوم ہونے پر گرفتاری کی پوری تیاری سے پولیس اسٹیشن چلے آئے، لیکن چوں کہ پولیس نے

جماعت کے چھ اور آر۔ایس۔ایس کے ایک فرد ہی کا وارنٹ تیار کیا تھا اس لیے موصوف کو واپس کر دیا گیا۔

شروع میں ہمیں وساپور، ضلع احمد نگر کی جیل میں رکھا گیا۔ ہم نے جیل میں قدم رکھا ہی تھا کہ آر۔ایس۔ایس کے افراد نے مطالبہ کیا کہ ایک پروگرام رکھ کر آپ لوگ جماعت اسلامی کا تعارف کرائیے کیوں کہ ہم آپ کو نہیں جانتے۔ چناں چہ تعارفی پروگرام میں پہلے قاضی خورشید احمد صاحب جامنیر اور بعد میں خاکسار نے اظہار خیال کیا اور ان حضرات کے سوالات کے جوابات دیے۔ درج ذیل موضوعات پر سوالات کیے گئے:

۱۔ مسلم پرسنل لا اور یکساں سول کوڈ

۲۔ تعددِ ازدواج (ان لوگوں کا ذہن یہ تھا کہ اسلام میں چار شادیاں لازمی ہیں)

۳۔ طلاق کا مسئلہ

۴۔ مسلمان جمعہ کے دن کیوں نہاتے ہیں؟ (واضح رہے کہ ۱۸۵۰ء سے مراٹھی میں جو ڈرامے لکھے گئے ان میں اسی طرح کی باتیں لکھ کر مسلمانوں کا مذاق اڑایا گیا ہے)

پہلے سوال کا جواب یہ دیا تھا کہ ناگپور میں جماعت کا ایک وفد گرو گولوالکر جی سے شمس پیرزادہ صاحب کی قیادت میں ملا تھا۔ شمس صاحب کے اس سوال پر کہ یکساں سول کوڈ کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟ گرو گولوالکر صاحب نے جواباً کہا تھا کہ اس ملک کو Unity کی ضرورت ہے، Uniformity کی نہیں۔ اور جو لوگ Uniformity چاہتے ہیں وہ مورکھ (بے وقوف) ہیں۔ (کیوں کہ یہ بات ورن آشرم کے نظام کے لیے موت کی حیثیت رکھتی ہے)

اس جواب پر سب خاموش ہو گئے۔

جیل میں آر۔ایس۔ایس کے افراد کی تعداد بہت کم تھی اور دیگر مخالف سیاسی جماعتوں کے افراد زیادہ تھے۔ وہ ایسا کرتے تھے اپنے دو افراد، ۲۰ یا ۲۵ طالب علموں یا نوجوانوں کے ساتھ مل کر احتجاج کرتے، اور انہیں Under Trial جیل میں رکھا جاتا۔ یہ دونوں ان طلبہ کی برین واشنگ کر کے انہیں اپنے کام کے بناتے تھے۔ اس طرح

ایجی ٹیشن کی وجہ سے بعد میں ان کی تعداد بڑھ گئی تھی۔

دو ماہ بعد تمام سیاسی قیدیوں کو سپیریر کلاس دی گئی۔ پوچھا گیا کہ آپ پونہ یا ناسک جیل میں، کہاں جانا چاہتے ہیں؟ ہم پانچ ارکان جماعت نے جو ضلع جلگاؤں کے تھے، پونہ کی جیل کو ترجیح دی۔ وہاں پہنچے پر معلوم ہوا کہ شولا پور کے تین ارکان موجود ہیں۔ ہم آٹھ افراد ہو گئے۔ جن میں سے جماعت کے دو کارکن اور ایک کانگریسی جلدر ہا ہو گئے تھے۔

ہند و پاک جنگ کے موقع پر ۱۹۶۵ء میں مہاراشٹر میں مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ ان میں تحریک آزادی کے کانگریسی رہنما، جماعت اسلامی ہند اور دیگر سیاسی سماجی رہنماؤں کے علاوہ جرائم پیشہ لوگ بھی شامل تھے۔ ہم لوگوں پر بڑی سختی کی جاتی تھی اور مسلمانوں کو قوم دشمن، ملک دشمن اور غدار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اب ایمرجنسی میں جیل کا عملہ ڈراڈرا سا رہتا، کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ جہاں چاہیں چلے جائیں، نہ کوئی پوچھتا نہ تلاشی لی جاتی۔ ایک کمرہ خالی کر کے وہاں جماعتی اور درس و تدریس کے پروگرام چلانے لگے۔

میں نے مکتبہ الحسنات رامپور کی شائع شدہ ہندی ترجمۂ قرآن کی گیارہ کاپیاں ممبئی سے منگوا کر انہیں پڑھوانا شروع کر دیا تھا۔ رہائی کے بعد واجد صاحب ایم پی ہو گئے تھے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے دوران ان لوگوں نے بمبئی اور پونے کے اپنے انتخابی جلسوں میں ہندی ترجمہ قرآن کے بہت سے حوالے دیے۔ مولانا سید عبد اللہ بخاری صاحب کی تقریر کرافورڈ مارکیٹ ممبئی میں تھی، اس میں بھی پروفیسر کانٹکر صاحب صدر جلسہ نے کہا کہ جب دیشمکھ صاحب نے ہمیں قرآن کا ہندی ترجمہ جیل میں دیا تو ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیل نہ جاتے تو قرآن پڑھنے کو نہیں ملتا۔

ایک روز یہ پروگرام طے ہوا کہ جے پرکاش نارائن کے لیے دعائیہ جلسہ ہوگا۔ جماعت کی نمائندگی مجھے کرنی تھی۔ لیکن ''جن سنگھ'' کے ایک ممبر نے جو اس جلسے کے کنوینر تھے، مجھ سے کہا کہ آپ نہ آئیں کیوں کہ یہ سیاسی لوگوں کا پروگرام ہے۔ ہم لوگ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ادھر میرے نام کا اناؤنسمنٹ ہوتا رہا۔ بعد میں جب

میں نے بتایا کہ مجھے تو اتنا جوشی نے منع کر دیا تھا تو سیاسی لوگوں نے انہیں خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

آر۔ایس۔ایس مہاراشٹر کے ذمہ دار ایڈوکیٹ بابا بھڑے تھے۔ یہ شخص بہت کٹر تھے اور بظاہر اصولی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی بیرک میں شولا پور جماعت کے تین رفقا تھے جن سے وہ حسنِ اخلاق سے پیش آتے۔ ان کے ''یوم پیدائش'' کے موقع پر ان کو ہندی ترجمہ قرآن دیا گیا اور شیر خورمہ سے تواضع کی گئی۔ (اس کمرے میں جس کو ہم نماز کے لیے استعمال کیا کرتے تھے) اپنی تقریر میں ایڈوکیٹ بھڑے نے کہا کہ ''ہم آپ سے بدلہ لیں گے۔ آپ کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں نماز پڑھیں گے،— نہیں چلے گا''۔ کہتے ہیں ہم ختنہ کریں گے،— نہیں چلے گا۔'' ''ہم تمہیں ملازم رکھیں گے اور تم ہماری لڑکیوں پر نگاہ ڈالو گے،— نہیں چلے گا''۔ ''تم نے مندروں کو توڑ کر مساجد بنائی ہیں' ہم مساجد توڑ کر مندر بنائیں گے—'' اصل الفاظ یاد نہیں رہے لیکن ان کی یہ باتیں اشتعال پیدا کرنے والی تھیں۔ ایمرجنسی کے بعد یہی تقریر مکمل طور پر انھوں نے آکوٹ کے دفتر جماعت میں بھی کی، جس کو میڈیا اور مخالف جماعتوں نے جماعت اسلامی کے خلاف خوب استعمال کیا۔ اسی سلسلے میں محترم امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا محمد یوسف صاحب کی ''یا لیت قومی یعلمون'' نامی کتاب شائع ہوئی جس میں مندرجہ بالا باتوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور میرا بھی ذکر ہے۔

میرے مطالعہ اور مشاہدہ کے مطابق آر۔ایس۔ایس برہمنوں کو ہر جگہ قائدانہ حیثیت میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے وہ شاکھائیں چلا کر برین واشنگ کر کے انھیں چھوڑ دیتی ہے تاکہ وہ کسی بھی سیاسی پارٹی میں جائیں تو ان کی حیثیت قائدانہ ہو۔ اسکولی نصاب وہ تیار کریں' جج' وکیل' پرائیوٹ سکریٹری وہ رہیں اور وزیروں کو بھی استعمال کریں اور ہر جگہ برہمنوں کو فائدہ پہنچے۔

محترم امیر جماعت اور میں نے آر۔ایس۔ایس کے صدر دیورس صاحب کو خطوط لکھے کہ کیا آپ کی پالیسی یہی ہے؟ ہے تو اس کا اعتراف کریں' نہیں ہے تو اس کی

تردید کریں۔ ایک مرتبہ بھساول سے گزرتے ہوئے مسٹر دیورس نے مجھ سے کہا کہ ''آپ کا اور امیر جماعت کا' دونوں خطوط مجھے ملے' میں نے فون پر جب بھی امیر جماعت سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی وہ موجود نہیں تھے۔ چوں کہ آر۔ ایس۔ ایس کا پھیلاؤ ملک گیر ہے اس لیے اس میں مختلف جذبات احساسات رجحانات اور سوچ رکھنے والے ہیں۔ لیکن ہماری پالیسی وہی ہے جو میری تقاریر' اخبارات میں اور ٹیلی ویژن پر آتی ہیں۔'' اور یہ بھی کہا کہ میں نے آپ کا مضمون پڑھا ہے۔ (دراصل میرا وہ مضمون جس میں آر۔ ایس۔ ایس پر سخت تنقید کی گئی تھی انہی کے مراٹھی ترجمان میں شائع ہوا تھا۔)

دیورس صاحب بظاہر بڑے شریف اور میٹھے شخص تھے۔ ذیابیطس کے علاوہ بھی کئی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ روزانہ بعد عصر ہم ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے تھے۔

آر۔ ایس۔ ایس کے Under Trial وہ نوجوان جو ایجی ٹیشن کے نتیجہ میں آئے تھے' ان کو سیکنڈ کلاس میں رکھا گیا تھا۔ طے ہوا کہ ہر گروپ، ان نوجوانوں سے باری باری سے اپنا تعارف کرائے گا۔ پہلے دن وہاں سوشلسٹ پارٹی کے نمائندے گئے لیکن انھوں نے ہونگ کی اور سوشلسٹوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا جب کہ وہ مہاراشٹر کے ریاستی سطح کے رہنما تھے۔ دوسرے دن میری باری تھی' میں اللہ سے دعا کرتا ہوا پہنچا کیوں کہ مجھے پہلے دن کا واقعہ معلوم تھا۔ مگر یہ دیکھ مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے بات بڑے غور سے سنی اور سوالات بھی کیے، اسی طرح کے سوالات جو ان کے بڑے کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مراٹھی ہندی لٹریچر بھی مانگا۔ افسوس کہ گھر سے لا کر دینے والا کوئی نہیں تھا۔

شمس پیرزادہ صاحب اور کیف نوگانوی صاحب کے گروپ کی کوششوں سے آٹھ ماہ بعد ہی ہمارا ریلیز آرڈر آ گیا تھا۔ میں جب تمام لوگوں سے الوداعی ملاقات کرنے لگا تو وہ بڑی مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی اشارہ کرتا کہ ان لوگوں نے اندرا گاندھی کے پروگرام کی تائید کر کے اپنی رہائی کروالی ہے۔ کسی کو شک تھا کہ شاید معافی مانگ لی۔ جب میں جیل کے دفتر پہنچا تو وہاں انڈر ٹیکنگ فارم رکھا ہوا تھا۔ انڈر ٹیکنگ فارم کا مضمون کچھ درج ذیل انداز کا تھا جس کی اصل کاپی میں لے نہ سکا تھا:

"میں شہری نظام اور امنِ عامّہ کو نقصان پہنچانے والی کسی مہم میں، نیز شہریوں کے لیے ضروری چیزوں کی سپلائی اور ان کی خدمت میں رکاوٹ بننے والی کسی بھی تحریک میں شامل نہیں رہوں گا۔ ایمرجنسی کی موجودگی میں کسی بھی حکومت مخالف تحریک اور ایجی ٹیشن میں شرکت نہیں کروں گا۔ ملاوٹ نہیں کروں گا۔ وغیرہ۔"

میں نے جیلر سے کہا کہ میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ "رہائی کے لیے یہ ضروری ہے" پھر وہ ہمدردانہ انداز میں کہنے لگا کہ بڑے بڑے لیڈر آتے اور یہ کہہ کر دستخط کرتے ہیں کہ کسی سے مت کہنا۔ میری نظر میں آپ بڑے بھی نہیں ہیں، آپ دستخط کر دیں۔ میں نے تحریر لکھ کر دی کہ جب ہم نے اس سے قبل بھی اس طرح کچھ نہ کیا تو آئندہ نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تحریر دے کر جب میں لوٹ کر جیل میں داخل ہوا تو سب سے پہلے آر۔ ایس۔ ایس کے صدر دیورس صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف نے مجھے بڑی دیر تک گلے سے لگائے رکھا اور کہا کہ رات کا کھانا میرے ساتھ کھایئے گا۔ جب میں اپنے کمرے پر پہنچا تو لوگوں کا ہجوم جمع تھا، میرے انڈر ٹیکنگ پر دستخط سے انکار کی خبر جنگل کی آگ کی طرح جیل میں پھیل گئی تھی۔ وہ انڈر ٹیکنگ کیا ہے؟ اور میں نے کیوں اسے Refuse کیا، لوگ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ مجھے دیورس صاحب کی بیرک میں جانے کا موقع نہ مل سکا جب کہ انھوں نے بیرک کے لوگوں کو ایک گھنٹہ رو کے رکھا اور میرے لیے آملیٹ بنوایا تھا۔

اس کے دوسرے دن سے اسلام اور جماعت کے تعارف کا اللہ تعالیٰ نے بہترین موقع فراہم کر دیا۔ ہر گروپ اور بیرک والے بلاتے، تقریر بھی سنتے اور سوالات بھی کرتے۔ ان کے علاوہ دو نشستیں قابلِ ذکر ہیں:

ا۔ آر۔ ایس۔ ایس کے وکیل والاولکر نے مجھے بلوایا، پاپلیٹ مچھلی سے تواضع کی اور کہنے لگے کہ آپ نے ہمارے لیے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے کیوں کہ انڈر ٹیکنگ کا مضمون ہمارا ہی حکومت کو دیا ہوا ہے کہ اس پر دستخط لے کر ہمارے کارکن چھوڑ دیے جائیں۔ لیکن آپ کے Refuse کرنے کے بعد اب ہم اس پر دستخط کریں گے تو یہ سیاسی خودکشی کے

مترادف ہوگا۔ لہٰذا آپ دستخط کر دیں' کیا آپ کے انکار سے اندرا گاندھی ڈر جائے گی۔ میں نے کہا یہ اصول کا سوال ہے' اسی کے مطابق میں عمل کر سکتا ہوں۔ میرے کیس کو سامنے رکھ کر آپ اپنی پالیسی وضع کر لیں۔ موصوف دو گھنٹے تک مجھے کنونس کرنے کی کوشش کرتے رہے اور کہتے رہے کہ پتھر سے سر ٹکرا کر اپنا ہی سر توڑ لوں گا۔

۲۔ سوشلسٹ گروپ کے رہنماؤں کی طرف سے بھی ردّ عمل سامنے آیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کون سا تیر مار لیں گے؟ آپ لوگ اور آر۔ ایس۔ ایس کی ہاف پینٹ والے ایک جیسے ہیں۔ اب آپ کی ۲۵۔۲۰ سال رہائی نہیں ہوگی۔ ان کی باتوں پر میں مسکراتا رہا۔ جب میں نے یہ کہا کہ اگر میرا جنازہ بھی جیل سے نکلا تو مجھے اس سے کوئی پریشانی نہیں ہے، اپنا اصول اور مقصد میرے سامنے ہے۔ البتہ آپ لوگ اپنی پالیسی متعین کر لیجئے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے' کہنے لگے کہ ہم آپ کا ٹیسٹ لے رہے تھے۔ پھر مزید کہا کہ آپ نے میدان مار لیا، آر۔ ایس۔ ایس کو پیچھے چھوڑ دیا ہے!

صرف پانچ دن کے بعد ہی میرا بغیر انڈر ٹیکنگ کے ریلیز آرڈر آ گیا۔ جیل میں جلسہ ہو رہا تھا وہیں مجھے اطلاع ملی تو میں جلسہ گاہ کے ٹیبل پر چڑھ گیا۔ لوگوں کو اس کی اطلاع دی تو جلسہ برخاست ہو گیا اور وہ سامان کے ساتھ مجھے لے کر گیٹ تک رخصت کرنے کے لیے آئے تھے۔

آخر میں ـــ ابتلاء و آزمائش سے گزرنے والے ہر فرد کے لیے ایک سبق آموز واقعہ:

> احمد بن حنبلؒ کو جیل میں ایک چور ملا' کہنے لگا ''میں چور ہوں' مجھ پر اتنی مار پڑی ہے کہ جسم کا کوئی حصہ نہیں بچا ہے۔ اس کے باوجود جب میں رہا ہو کر جیل کے گیٹ سے گزرتا ہوں تو وہیں سوچ لیتا ہوں کہ مجھے کہاں چوری کرنا اور کہاں نقب لگانا ہے۔ غیر اخلاقی کام میں یہ میری استقامت اور عزم و حوصلہ ہے' جب کہ آپ تو حق کے علمبردار ہیں' آپ کو میرے مقابلے میں زیادہ استقامت کا ثبوت دینا

چاہیے۔" امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ "وہ میرا استاد ہے، جب بھی بے صبری یا مایوسی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کے جملے یاد آجاتے ہیں"۔۔۔ وہ صرف احمد بن حنبلؒ کا ہی استاد نہیں بلکہ ابتلاء و آزمائشوں سے گزرنے والے تمام افراد کا استاد ہے جو راہِ حق میں استقامت اور عزم و حوصلہ سکھاتا ہے۔

قربتیں اتنی بڑھیں!

❑ محمد نعیم اللہ قریشی
ناگپور (مہاراشٹر)

۱۹۷۵ء میں اندرا گاندھی نے اپنے مخالفین کے خلاف جس بنا پر ایمرجنسی کا ناجائز استعمال کیا اس کا تعلق جماعتِ اسلامی ہند اور اس کے کارکنوں سے دور کا بھی نہیں تھا۔ یہ بھی اُسی طرح غلط اقدام تھا جیسا کہ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ میں مسلمانانِ ہند کو عموماً اور جماعتِ اسلامی ہند کے کارکنان کو بالخصوص DIR کے تحت جیلوں میں بند کرنا تھا۔ مگر ان دونوں موقعوں میں بڑا فرق تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران عام طور پر صرف مسلمانانِ ہند قید و بند کی صعوبتوں میں ڈالے گئے، مگر ۱۹۷۵ء کی ایمرجنسی میں مختلف غیر مسلموں کی تنظیموں کے ساتھ صرف جماعت اسلامی ہند کے کارکنوں کو گرفتار کیا گیا۔ دُوسرا فرق یہ تھا کہ اول الذکر موقع پر جیلوں میں صرف 'مسلمان' ہونے کی وجہ سے اُن کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں تھا، مگر ایمرجنسی کے موقع پر جیلوں میں کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا گیا۔

شہر ناگپور کی صورت حال اُس وقت ایسی تھی کہ جون ۷۵ء میں ایمرجنسی کی گرفتاریوں سے پہلے شہر کے وسط میں ایک ہال میں ''جن سنگھ'' کے منتخب اور چوٹی کے کارکنوں کا مسٹر ایل۔ کے۔ اڈوانی کی صدارت میں ایک اجلاس ہوا، جس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ جن سنگھ سے مسلمانوں کو کیسے قریب لایا جائے؟ اڈوانی صاحب دیر سے اس جلسہ میں آئے اور صرف آٹھ منٹ تقریر کی اور کچھ ایسی باتیں کہیں کہ مسلمان (جو صرف ۲۵ کی تعداد میں

تھے) ان کو سن کر جن سنگھ سے دور ہو گئے۔ راقم الحروف نے اڈوانی صاحب کی تقریر کا جواب دیا، جسے اُن کے کارکنوں نے صبر و تحمل کے ساتھ سنا۔ یہ لوگ ڈھائی سو سے کم نہیں تھے۔

مگر یہ کسے معلوم تھا کہ عنقریب ان حضرات سے جیل میں مہینوں کی ملاقات اور صحبت رہے گی۔ چانچہ سنٹرل جیل ناگپور میں جن سنگھ اور آر۔ایس۔ایس کے علاوہ غیر مسلم تنظیموں کے چیدہ چیدہ افراد کے ساتھ (جن کی تعداد ساڑھے چار سو سے کم نہ تھی) جماعتِ اسلامی ناگپور اور ودربھ کے ۳۲ افراد کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔

دوسری تنظیموں کے افراد کافی پڑھے لکھے اور مختلف سرکاری عہدوں پر فائز تھے اور اپنی پارٹیوں کے ذمہ دار بھی تھے۔

آر۔ایس۔ایس کے اُس وقت کے سربراہ (سرسنگھ چالک) بالا صاحب دیورس کو پونا سنٹرل جیل میں اور باقی تمام افراد کو ناگپور کی سنٹرل جیل میں رکھا گیا تھا۔

انھوں نے جیل میں اپنے منظم پروگرام جاری رکھے، اور ہم نے بھی دعوت حق کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی سعادت حاصل کی۔ ہم لوگ جیل میں آٹھ ماہ رہے اور دوسرے لوگ بیس، بائیس ماہ — تمام لوگ جیل کی سیکنڈ کلاس میں تھے۔ صبح کے چھ بجے سے شام کے چھ بجے تک ایک دوسرے سے ملاقاتیں، گفتگو، کتابوں، قرآن مجید کے ترجموں کا لین دین ہوتا رہتا تھا۔ ناشتہ اور کھانے کا انتظام ٹھیک ٹھاک تھا۔ بیماروں کو سرکاری دواخانہ (گورنمنٹ میڈیکل کالج اسپتال) لے جایا جاتا تھا۔ اعزاء و اقارب سے وہاں بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔

ہمیں رمضان، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ اور محرم وغیرہ کے مہینے بھی گزارنے کا موقع ملا۔ ہم نے رمضان کے روزے رکھے۔ دونوں عیدیں منائیں۔ عیدوں کے موقعہ پر شیر خرما اور بریانی سے غیر مسلموں کی تواضع کی۔ جیل کے افسران بھی ان تقاریب میں شریک رہے۔

طے ہوا کہ ہر جماعت جیل کے تمام ساتھیوں کے سامنے اپنے اپنے پروگرام پیش

کرے گی۔ یہ اہتمام آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے ذمہ دار اپنی قیام گاہ کے سامنے کرواتے تھے۔ ڈسپلن اور اپنے بزرگوں کا احترام جو وہ لوگ کرتے تھے، قابل دید تھا—سیاسی لوگوں کے علاوہ مذہبی پنڈت اور پیشوا بھی وہاں تھے۔

راقم الحروف نے وہاں ۹ رتقریریں کیں۔ تقاریر کے عنوانات—اسلام کا تعارف، بعض غلط فہمیوں کا ازالہ، جماعتِ اسلامی کی دعوت اور اس کا مقصد، روزہ و رمضان، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، شہادت امام حسینؓ کی حقیقت، وغیرہ۔

جیل میں آنند مارگیوں کے بھی ۲۷ رافراد تھے جو کافی پڑھے لکھے اور ذہین تھے۔ اُن کے مذہبی پیشوا سے کافی قریبی تعلقات ہو گئے تھے اور انھوں نے اس قدر اسلام کا مطالعہ کر لیا تھا کہ وہ اسلام قبول کرنے کے لیے آمادہ نظر آنے لگے تھے۔

اُس وقت آنند مارگیوں کے کُل ہند گرو برت رکھے ہوئے تھے۔ وہ جیل میں اُن کے تعلق سے دو باتیں فخریہ بیان کر رہے تھے کہ اُن کے گرو معلق بیٹھے ہیں اور یہ کہ ایک ہزار دن سے زائد گزر گئے مگر کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں—راقم الحروف نے ایک تقریر میں اس کی حقیقت کھول دی۔ قرآن سے اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کر کے اُن کو بتایا گیا کہ ابھی تو اُن کے گرو اُن کے بقول تین سال سے ہی بھوکے ہیں۔ تاریخ میں اصحاب کہف ۳۰۹ سال تک اسی حالت میں زندہ رہے اور اس شرف میں ان کا کتا بھی ان کے ساتھ رہا —رہی دوسری بات کہ اُن کے گرو معلق بیٹھے ہیں تو اُن کو بتایا گیا کہ تاریخ میں کتنے ہی افراد (مرد و عورتوں) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پانی پر چلتے تھے، ہوا میں اُڑتے تھے، لیکن یہ واقعات نہیں بلکہ افسانے ہیں، تو پھر وہ دونوں باتیں جو آپ اپنے گرو کے بارے میں بیان کر رہے ہیں ان کی حیثیت بھی افسانے کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اُن صاحب نے وہ چرچا بند کر دیا۔ اس ناچیز نے انہیں انسانی تاریخ کے سب سے عجیب واقعہ (معراج) کی تفصیلات سے بھی آگاہ کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ ان چند ماہ میں دعوت و تبلیغ اور اپنی تربیت و تزکیہ کا جس قدر کام ہوا اتنا کام شاید پھر کبھی نہیں ہوا۔ مہاراشٹر میں ہم لوگ جلد ہی رہا ہو گئے، یعنی تقریباً ۸ ہی

مہینوں میں۔ اس بات کا بہت افسوس ہے کہ جیل کے ان غیر مسلم ساتھیوں سے بعد میں ویسے تعلقات نہ رہ سکے۔

وہ لوگ ۲۰/۲۲ ماہ جیل میں رہے۔ ہم نے بعد میں اُن کو اپنے کئی پروگراموں میں بُلایا اور وہ آئے بھی— مگر وقت کے ساتھ یہ سلسلہ اور ربط کم سے کم ہوتا گیا اور اب شاذ ہی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔

مہاراشٹر میں بی جے پی کی حکومت قائم ہوئی تھی تو انھوں نے ایک بار ہمیں بھی بلایا اور جیل کے اُن تمام ساتھیوں کا جو اُس تقریب کے وقت تک حیات سے تھے، اُن کا ''سواگت اور سمّان'' کیا گیا۔

وہ لذتِ نماز

❑ محمد سمیع

ملکاپور (مہاراشٹر)

۱۷ر جولائی ۱۹۷۵ء کو صبح حسب معمول اپنی روزانہ کی مصروفیات سے فارغ ہو کر اسکول چلا گیا۔ جمعہ کی وجہ سے دوپہر میں گھر نہیں آیا۔ اس دن ٹھیک سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد پھر اسکول چلا گیا۔ اسکول کا آخری پیریڈ خالی تھا۔ میں اسٹاف روم میں بیٹھ کر ساتھیوں سے گفتگو کر رہا تھا کہ آفس کے سامنے پولیس کی گاڑی نظر آئی۔ سب انسپکٹر صاحب LIB (CID) کا کانسٹبل اور دو تین پولیس والے آفس میں آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ لوگ آکر ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چپراسی اسٹاف روم کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ قریب آنے پر چپراسی نے کہا کہ سمیع صاحب کو بلایا گیا ہے۔ میں آفس پہنچا تو سب انسپکٹر نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلیے آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنی ہے۔ عصر کی اذان ہو چکی تھی۔ میں نے کہا نماز پڑھ کر چلتے ہیں۔

میں سامنے والی مسجد میں نماز عصر کے لیے چلا گیا۔ میرے ساتھ میرے دوست جناب قاضی معین قیصر صاحب (جو اس وقت رکن نہیں تھے) بھی تھے۔ ہم نے نماز عصر ادا کی اور اسکول واپس آ گئے۔ پولیس کی گاڑی گیٹ ہی پر کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ پولیس والوں نے قاضی معین الدین قیصر صاحب سے کہا کہ آپ کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اکیلے ہی پولیس اسٹیشن لے گئے۔ وہاں آر۔ ایس۔ ایس کے دو ذمہ دار بھی موجود

تھے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ دیگر جماعتوں کے ساتھ جماعت اسلامی ہند پر بھی پابندی لگادی گئی ہے اس لیے آر۔ایس۔ایس، آنند مارگ اور جماعت اسلامی کے ارکان کو گرفتار کیا جارہا ہے۔ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ میں نے پولیس اسٹیشن ہی میں نماز مغرب ادا کی، نماز کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ یکسوئی اور رجوع الی اللہ کی کیفیت محسوس ہوئی۔ عمر بھر کی نمازوں میں بھی وہ لذت نہیں حاصل ہوئی جو اس وقت کی نماز میں محسوس ہوئی۔

وہاں موجود ہوم گارڈ کے ذریعہ گھر اطلاع دی کہ رات کا کھانا، سوٹ کیس، بستر اور کپڑے لے کر کوئی پولیس اسٹیشن آ جائے۔ گھر میں ابا جان موجود تھے۔ میرے چار بھائی اور ایک بہن اسکول میں پڑھتے تھے، میں صرف اکیلا برسرِ روزگار تھا۔ ابا جان کی بھی کوئی قابل ذکر آمدنی نہیں تھی۔ والدہ صاحبہ، والد صاحب، بیوی اور ایک بچی، ایک خالہ اور ایک ماموں زاد بھائی اس طرح گھر میں کل بارہ افراد تھے۔ والد محترم تمام سامان لے کر تشریف لائے۔ میں نے کہا کہ مجھے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ نہ معلوم کب رہائی نصیب ہو۔ صبر کیجیے، اللہ پر بھروسہ رکھئے، وہی حامی و ناصر ہے۔ میں نے کھانا کھایا اور عشاء کی نماز ادا کی۔ والد صاحب واپس چلے گئے۔

اس کے بعد مجھے اور آر۔ایس۔ایس کے دونوں ذمہ داروں کو کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ میں نے اپنا بستر کھولا اور سو گیا۔ گہری نیند آئی۔ آر۔ایس۔ایس کے دونوں ذمہ دار رات بھر جاگتے رہے۔ رات تین بجے دروازہ کھلا۔ ہم سے کہا گیا کہ تیار ہو جایئے بلڈانہ چلنا ہے۔

صبح کی اذان کے وقت بلڈانہ پہنچے۔ بارش ہو رہی تھی۔ میں نے وضو کے لیے پانی تلاش کیا۔ وضو کر کے آ رہا تھا کہ مولانا ناصر اللہ خاں صاحب پیپل گاؤں راجہ سے ملاقات ہوئی۔ موصوف اس وقت رکن نہیں تھے لیکن ان کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔ ہم نے فجر کی نماز ادا کی۔ وہاں سے ہمیں بلڈانہ کی سنٹرل جیل روانہ کیا گیا۔ اس وقت تک آر۔ایس۔ایس کے چالیس کے قریب افراد گرفتار کر کے لائے جا چکے تھے۔ جماعت اسلامی ہند کے ہم دو ہی افراد تھے۔

۱۸ر جولائی ۱۹۷۵ء کی شام چھ بجے ہم تمام کو پولیس گاڑی میں بٹھا کر ناگپور لایا گیا۔ ناگپور کی سنٹرل جیل میں ناگپور اور آکولہ کے رفقا سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ سب ایک ہی بیرک میں تھے اور ہمیں دوسری بیرک میں رکھا گیا۔

جیل میں ہمارا معمول صبح سویرے اٹھ کر نمازوں کا اہتمام، قرآن کی تلاوت، مطالعہ قرآن ولٹریچر اور ساتھی قیدیوں میں اسلام کا تعارف تھا۔ چند روز کے بعد ایک سلسلہ شروع ہوا کہ جیل کے تمام ساتھی جمع ہوتے اور ہر جماعت کا ذمہ دار اپنی جماعت کا تعارف اور سرگرمیاں پیش کرتا۔ ہماری جانب سے مولانا محمد نعیم اللہ قریشی صاحب نے اسلام کا اور جماعت کا تعارف پیش کیا۔ دیگر جماعتوں کے نوجوان ہم لوگوں سے بہت مانوس ہوگئے تھے۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر گفتگو کرتے۔ اپنے شکوک وشبہات پیش کرتے، جن کا ازالہ کیا جاتا تھا۔ اُن کے ذمہ داروں کے رویہ سے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ شکوک وشبہات اور ان کے ازالے کی بات انہیں ناگوار گزرتی ہے۔

بہر حال سولہ سترہ دن ہی گزرے تھے کہ ۴ر اگست ۷۵ء کو بلڈانہ سے ایک سب انسپکٹر میری رہائی کا آرڈر لے کر آیا اور کہا کہ آپ کو رہا کیا جاتا ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ مجھے کیوں رہا کیا جارہا ہے جب کہ میرے دیگر ساتھی ابھی جیل میں ہی ہیں۔

بعد میں گھر آکر معلوم ہوا کہ میرے ہیڈ ماسٹر جو غیر مسلم تھے اور میرے کام، اخلاق و کردار سے بہت متاثر تھے، انھوں نے میری پرزور حمایت کی تھی اور مجھے رہا کردیا گیا۔

جماعت ملک دشمن نہیں

❑ ناصر اللہ خان
پیپل گاؤں راجہ، ضلع بلڈانہ (مہاراشٹر)

۱۹۷۵ء میں جب مسز اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی لگائی، اُس وقت ہماری بستی پیپل گاؤں راجہ، ضلع بلڈانہ میں جماعت اسلامی کے تین ارکان تھے۔ میں خود جماعت کا رکن نہیں تھا۔ میرے حقیقی بھائی مرحوم فاخر اللہ خاں صاحب امیر مقامی تھے۔

بطور تحدیث نعمت عرض ہے کہ اس چھوٹی سی بستی میں مختلف اوقات میں ہندستان کے چوٹی کے علمائے کرام مثلاً مولانا سید ابو الحسن علیؒ میاں صاحب ندوی، مولانا ابو اللیثؒ صاحب ندوی اصلاحی اور جناب سید حامد حسینؒ خطیب صاحب (سید صاحب جو ہمارے قریبی شہر کھام گاؤں کے انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں کے طالب علم رہے تھے اور شہر ایلچپور (نیا نام اچل پور) کے رہنے والے تھے کئی بار تشریف لائے اور عظیم اجتماعات میں ان کی شرکت ہو چکی تھی۔

میں اس وقت پیپل گاؤں راجہ میں تھا۔ یہ بات میرے علم میں نہ آئی تھی کہ ایمرجنسی نافذ ہوگئی ہے۔ میری کپڑے کی دکان تھی۔ بستی کے قریب ہی میں اپنے کھیت پر گیا ہوا تھا۔ جب گھر واپس آیا تو خبر ملی کہ پولیس کانسٹیبل بلانے کے لیے آئے تھے۔ عصر کا وقت قریب تھا، نماز عصر سے فارغ ہوتے ہی بھائی صاحب کو تفصیل بتا کر میں تھانہ چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ شاید پھر وہی DIR والا چکر ہو۔ وہاں مقامی اسٹیشن آفیسر بھی تھے اور کھام گاؤں سے آئے ہوئے سب انسپکٹر بھی۔ کہنے لگے آپ کی گرفتاری کا آرڈر ہے سپاہی کو چٹھی دے

کر کپڑے بستر منگا لیجیے کھام گاؤں چلنا ہے۔ میں نے کہا تو پھر جیپ میں چلتے ہیں میرا گھر روڈ پر ہی ہے وہاں سے سامان لے لیں گے۔ چناں چہ ہم فوراً سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ سامان آنے تک گرفتاری کی خبر پھیل چکی تھی لہٰذا کثیر تعداد میں لوگ جمع ہو گئے، سب انسپکٹر پریشان ہو گیا' اس کا خیال تھا کہ شاید لوگ مزاحمت کریں گے لہٰذا جلد نکلنے کا تقاضا کرنے لگا۔ ہم نے اطمینان دلایا کہ لوگ صرف ملاقات کرنے اور مجھے الوداع کہنے کے لیے آئے ہیں۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد ہم روانہ ہو گئے۔ کھام گاؤں اور اطراف سے آر۔ ایس۔ ایس ،جن سنگھ (موجودہ بھارتیہ جنتا پارٹی) اور دیگر تنظیموں کے لوگ رات گئے تک گرفتار کر کے لائے جاتے رہے۔ ہم سب کو پولیس وین میں بلڈانہ بھیج دیا گیا۔ ملکاپور سے جناب محمد سمیع صاحب رکن جماعت واحد مسلم تھے، باقی تمام غیر مسلمین۔ ۱۹۶۵ء کی گرفتاری کے مقابلے میں اب کی بار پولیس کے رویہ میں نمایاں فرق محسوس ہوا' نہ وہ قدغن نہ احتیاط نہ لوگوں سے ملنے ملانے پر کوئی پابندی۔ بلڈانہ پہنچ کر پہلے پولیس ہیڈ کوارٹرس کے وسیع و عریض ہال میں ٹھہرایا گیا۔ ہوٹل سے چائے، لاج سے کھانا منگوایا گیا اور پھر بذریعہ پولیس لاری ناگپور سنٹرل جیل بھیجا گیا۔ راستے میں بھی پولیس عملے کا رویہ ٹھیک ٹھاک رہا۔ ناندورہ میں ایک جن سنگھی کا پٹرول پمپ ہے، وہاں بہت دیر تک رکے، چائے کا دور چلا، وہاں سے ان لوگوں نے مختلف مقامات پر اپنے لوگوں کو فون کیے اور ہدایات دیں۔ کھام گاؤں میں غیر مسلمین نے خورد و نوش کا خوب سا سامان ساتھ کر دیا جو ناگپور تک کام آیا، بچا کھچا ناگپور سنٹرل جیل والے لے اڑے۔

سنٹرل جیل میں مسلمان کل ۳۵ تھے جن میں تین صاحبان مسلم لیگ آکولہ کے غلطی سے گرفتار کر لیے گئے تھے' بقیہ وابستگانِ جماعت تھے۔ ان تینوں کی رہائی بھی طویل مدّت بعد ہو سکی۔ غیر مسلمین میں آر۔ ایس۔ ایس، جن سنگھ' آنند مارگ، کمیونسٹ (ایم) سنگھرش سمیتی وغیرہ کے کوئی چار سو افراد تھے۔

جیل کے ساتھیوں سے ملاقاتیں اور گفتگوئیں ہوئیں۔ جماعت کے رفیقوں نے کوشش کی کہ ہفتہ میں ایک بار ''عام سبھا'' منعقد کی جاتی رہے، جس میں ہر مکتبہ فکر کو اپنی

بات پیش کرنے کا موقع ملے۔ جب دوسری تنظیموں کے لوگ تیار نظر آئے تو آر۔ایس۔ایس والوں کو بھی حامی بھرنی پڑی۔ پہلا پروگرام جماعتِ اسلامی کی جانب سے کیا گیا۔محترم مولانا محمد نعیم اللہ قریشی صاحب رکن مجلس شوریٰ حلقہ مہاراشٹر نے ''قرآن کا پریچیہ'' کے عنوان پر پر مغز و مدلل تقریر کی' سوالات کا موقع دیا اور ان کے جوابات دئے۔ جماعت کے معمر بزرگ رکن، جناب غلام احمد حسن صاحب مرحوم، علاقہ برار کے مشہور قائد ورہنما سابق ایم ایل اے جو خود بہت اچھے مقرر تھے' اردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی پر عبور رکھتے تھے، عربی استعداد بھی تھی، تحسین آمیز انداز میں بے اختیار بول اٹھے ''ہر کسے را بہر کارے ساختند، مولوی نعیم اللہ صاحب نے موضوع کا حق ادا کر یا''۔

جناب غلام احمد حسن صاحب مرحوم (تلے گاؤں دسا سر) آزادی سے پیشتر مسلم لیگ سے وابستہ اور اس پارٹی کے ایم ایل اے رہے تھے۔ ۴۷ء سے پیشتر لیگ سے استعفیٰ دیکر جماعت کی رکنیت اختیار کر لی تھی۔ بڑے اولوالعزم رو درر و دوٹوک بات کہنے کے عادی، آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ پر تو گویا طبیعت اور بھی موزوں ہوتی تھی، گفتگو میں، آورد نام کو نہ ہوتی آمد ہی آمد کا سلسلہ رہتا تھا۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

دوسرا ہفتہ آر۔ایس۔ایس وجن سنگھ کا تھا۔ کھام گاؤں جی ایس کالج کے لکچرر شری ساسر بودھے صاحب نے تقریر کی (جو اچھے مقرر تھے اور اچھی ہندی بولتے تھے) لطف کی بات یہ کہ اُنہیں دوران اسیری ان کی مراٹھی تصنیف ''جیون مولیہ'' (اقدار حیات) پر حکومت نے اعزازی انعام دیا۔ مولانا محمد نعیم اللہ صاحب اور عاجز نے اُن سے گیتا کا کافی حصہ پڑھا۔ اسی طرح باری باری آنند مارگ، کمیونسٹ پارٹی وغیرہ کو بھی موقعہ ملا اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک باتیں پہنچتی رہیں مگر آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے افراد جماعت کے پروگرام میں شرکت سے کنی کاٹنے لگتے تھے۔ گھیر گھار کر لایا جاتا۔ اس کے علاوہ وفود کی شکل میں انفرادی طور پر اور اکثر گروپ کی شکل میں مل بیٹھنے پر بھی مختلف انداز میں دعوت کے مختلف پہلو سامنے آتے رہتے۔ بعض غلط فہمیاں دور ہوئیں' ایک دوسرے کو سمجھنے، جانچنے، پرکھنے کے مواقع حاصل رہے۔ اس کا فائدہ ایمرجنسی کے بعد کے جنرل

الیکشن میں نمایاں طور پر سامنے آیا۔ جب یہ بات ان کے علم میں لائی جاتی کہ جماعت اسلامی کے ممبر اور متفق (موجودہ اصطلاح کارکن) اپنے لیے شرط لازم سمجھتے ہیں کہ وہ کسی بھی حرام وغلط کام کے مرتکب نہ ہوں، حرام آمدنی کی راہ اختیار نہ کریں، مثلاً شراب، جوا، سٹہ، لاٹری، بلیک مارکٹنگ، اسمگلنگ، رشوت اور ہر طرح کا کرپشن۔ یہ بات ان کے لیے بڑی تعجب خیز تھی اور جب ہم خاص طور پر وطن کی محبت کے ان دعویداروں (بزعم خود) اور وطن کی محبت میں لہک لہک کر گانے والوں سے پوچھتے کیا آپ کی تنظیم کا بھی یہ اصول ہے؟ باہر کی بات چھوڑیے خود اسسٹنٹ جیلروں میں کئی ایسے تھے جو ان تنظیموں سے وابستہ تھے، دیکھا گیا کہ وہ بے ایمانیوں اور بد دیانتیوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ گو برہمن تھے مگر اکثر معاملات میں جماعت والوں پر بڑا بھروسہ رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی پیچیدہ سوال سامنے آتا تو صحیح صورت حال جاننے کے لیے جماعت کے نمائندوں کو بلا کر تحقیق کرتے۔

میں کہہ آیا ہوں کہ ۶۵ء میں اور ۷۵ء میں جیل کے عملے کے رویہ میں نمایاں فرق تھا۔ ۶۵ء میں ہم جس بیرک اور ایریا میں داخل کیے گئے تو بس رہائی کے وقت ہی وہاں سے نکل پائے مگر ۱۹۷۵ء میں تو پوری جیل کھلی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے باہر سے نامہ و پیام برابر چلتے رہتے۔ میڈیکل گراونڈ پر میڈیکل کالج جانا تو گویا ان کا ایک پکنک پروگرام تھا۔ خوب ملاقاتی آتے، گھر سے کھانا آتا، ان میں جو مقامی تھے ان کے تو بال بچے اعزا، اقربا سب آتے، ابتدا ہی میں تمام سیاسی قیدیوں کو سپیریر کلاس دے دی گئی تھی۔

رفقاے جماعت میں بڑی تعداد ان کی تھی جن کے ذمے اپنے کنبے کی کفالت تھی ان کی ملازمت خطرہ میں پڑی، کاروبار متاثر ہوئے۔ یہ یقیناً سخت ابتلاء و آزمائش سے گذرے۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوب خوب جزائے خیر سے نوازے۔ آمین۔

یوں پورے ہندوستان میں جماعت کے لوگ بھی سب کے ساتھ عام طور پر ۲۱ ماہ جیل میں رہے، صرف صوبۂ مہاراشٹر ایسا تھا جہاں ۷ ماہ بعد جماعت کے تمام لوگوں کو رہا کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں خصوصی طور پر جناب غلام حسنین کیف نوگانوی صاحب (بھنڈارہ)

اور برادرِ محترم مرحوم محمد ضیاء الحق خان صاحب (کھام گاؤں) نے ایک ذمہ دار وفد تیار کیا جس میں مرحوم محمد عثمان فاروقی صاحب ایم ایل سی آکولہ، مرحوم محمد شفیع صاحب ایم پی (چندر پور)، حضرت مولانا عبد الکریم پاریکھ صاحب مدظلہ العالی وغیرہم شامل تھے۔ وہ ناگپور میں اسمبلی سیشن کے وقت وزیر اعلیٰ شنکر راؤ چوہان سے ملے۔ چوہان صاحب علاقہ مراٹھواڑہ کے باشندے اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے فارغ اردو فارسی خوب جاننے والے تھے۔ کہنے لگے میں نے جماعت کا لٹریچر پڑھا ہے میں خود تو مطمئن ہوں کہ جماعت کی سرگرمیاں Antinational اور Prejudicial نہیں ہیں مگر یہ سنٹر کا معاملہ ہے۔ میں میڈم (اندرا گاندھی) سے بات کرونگا اور کوشش کرونگا کہ ان لوگوں کو جلد رہا کر دیا جائے' چناں چہ مہاراشٹر کے وابستگان جماعت کو ۷ ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔

قید و بند کے دوران بعض رفقا کو پریشان کیا گیا' بعض کو ہتھکڑی لگائی گئی' عام قیدیوں کے ساتھ حوالات میں رکھا گیا لیکن اللہ نے احباب کو ہر مرحلے میں ثابت قدم رکھا۔ الحمد للہ۔

وقار بلند ہوا

❑ سید شبیر علی
آکوٹ، ضلع آکولہ (مہاراشٹر)

کوئی بھی آئے مصیبت، مسکرا دیتا ہوں میں
مجھ کو پاسِ احترام کاتبِ تقدیر ہے

ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد جماعت اسلامی ہند کے مرکزی ذمہ داراور دیگر اہم لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ دوسرے دور میں جماعت کے امرائے مقامی اور تیسرے مرحلے میں عام ارکان گرفتار کیے گئے۔ شہر آکوٹ سے مقامی امیر جناب انصار خاں صاحب گرفتار کر کے ناگپور سنٹرل جیل لے جائے جا چکے تھے۔ خفیہ ڈپارٹمنٹ کے دو افراد ڈیوٹی کے دوران اسکول آئے تو راقم ان لوگوں کے ہمراہ تھانے چلا گیا اور گھر سے ضروری سامان منگوالیا۔ آکوٹ سے آکولہ اور پھر ناسک سنٹرل جیل تک پولیس کا رویہ نامناسب نہ تھا۔ بڑے گیٹ کے بغل والے کمرے میں سامان کی چیکنگ ہوئی۔ جہاں ہمارے سامان میں قرآن مجید تھا وہیں آر۔ ایس۔ ایس والوں کے ساتھ اُن کی وردی ضرور تھی (خاکی ہاف پینٹ، کالی ٹوپی، سفید شرٹ)۔

سامان کی تفتیش کے بعد میدان سے بیرکوں کی طرف گزرتے وقت موسیقی جاری تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا ہمارے استقبال میں بینڈ بج رہا ہے، جو ہمارے لیے تعجب اور حیرت کی بات تھی۔ مگر بات دراصل یہ تھی کہ اس وقت قیدیوں کو بینڈ باجے پر ڈرل کروائی جا رہی تھی جو مہندی کی باڑھ کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی اور ہم غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔

مہاراشٹر کی جماعت کے ذمہ دار وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ مولانا عبدالرشید عثمانی صاحب جناب مولانا عبدالقیوم صاحب — ان حضرات سے مصافحہ و معانقہ ہوا۔

نظر بندوں کی بڑھتی تعداد کی بنا پر عادی مجرموں سے کچھ بیرکیں خالی کروائی جا رہی تھیں اور آنے والوں کو ان ہی بیرکوں میں رہنا تھا جن میں مچھروں اور جوؤں کے ڈیرے تھے۔ پہلے دن ان دونوں فوجوں نے ہم بے گناہوں پر حملہ کر دیا اور کپڑوں اور بستروں میں اپنا ڈیرہ جما لیا جس کی وجہ سے رات بھر سو نہ سکے۔ دوسرے دن شکایت پر جیلر نے فوراً ڈی ڈی ٹی اور دیگر ادویات سے صفائی کروائی۔ جیل کے تین کمروں کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے کیوں کہ ان میں گاندھی جی، پنڈت نہرو اور لوک مانیہ تلک انگریزوں کے زمانے میں قید تھے۔

پہلے سے موجود رفقا نے باجماعت نماز، درس قرآن اور دیگر دینی سرگرمیاں شروع کر رکھی تھیں۔ ایک دن راقم کو بھی درس قرآن کا موقع ملا تو سورۂ یوسف کے پہلے رکوع کی تشریح پیش کی۔ یوں تو عام دنوں میں بھی اس سورہ کی تلاوت اور تفسیر پڑھنے میں ایمان پرور سرور حاصل ہوتا ہی ہے لیکن جیل کے اندر تو کچھ اور ہی کیفیت پیدا ہوئی۔

ہم اپنی اپنی بیرکوں میں جماعت کی پالیسی پروگرام اور دعوت کو واضح کرتے تھے لیکن اس کے علاوہ اجتماعی طور پر بھی ہر پارٹی ایک ایک دن اپنی اپنی پالیسی اور پروگرام پیش کرتی تھی۔ جماعت کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ سوالات کے جوابات بھی مولانا محمود احمد خاں صاحب دیتے تھے۔

عیدالاضحیٰ کی نماز میں سزا یافتہ قیدی اور میسا کے نظر بند دونوں طرح کے افراد میدان میں جمع ہوئے تو وارڈنوں اور کانسٹیبلوں نے خلط ملط ہونے سے روکا۔ اُن کو بتایا گیا کہ نماز کی صفوں میں امتیاز باقی نہیں رہتا' اس پر منتظمین کو تعجب ہوا۔ مولانا محمود احمد خاں صاحب نے اسوۂ ابراہیمیؑ کو پیش کیا اور جیل کے باہر سے آئے ہوئے امام صاحب نے نماز پڑھائی۔

کھانے کا انتظام اس طرح تھا کہ سوکھا راشن بیرکوں میں موجود لوگوں کی تعداد کے

مطابق مل جاتا اور سزا یافتہ قیدیوں کے ذریعہ پکوایا جاتا، پھل دودھ اور گھی کی تقسیم کے ذمّے دار مقرر کر دئے گئے تھے۔ گھی بانٹنے والے ذمہ دار آر۔ایس۔ایس کے ایک صاحب تھے۔ یہ کم زیادہ کر دیتے تھے۔ جناب غلام دستگیر صاحب (کلیان والے) نے ایک دن کہا کہ اگر تمہارے ہاتھوں میں اقتدار آئے تو کیا تم ایسی ہی نا انصافی سے کام لوگے؟ وہ صاحب شرمندہ ہوئے اور آئندہ گھی سامنے رکھ کر کہہ دیتے کہ صاحب اپنی پسند کے مطابق لے لیجئے۔

مولانا رطب علی صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے' اُن کی خدمت میں روزانہ علی الصبح چائے بنا کر پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ مولانا کمیونسٹوں کے سوالات کے جوابات حکیمانہ انداز میں دیتے۔ ایک نوجوان توان سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔

ایک دن دلچسپ لطیفہ ہوا۔ جناب مستجاب اللہ خاں صاحب نے ۷ کپڑے دھونے کے لیے دئے' اس نے ۶ واپس کیے۔ ۶ اور ۷ پر بحث ہوئی۔ خاں صاحب نے کہا ایک پاجامہ کم ہے۔ دھوبی نہ مانا۔ دراصل اُس نے غلطی سے دوسری بیرک میں کسی غیر مسلم کے کپڑوں میں پاجامہ دے دیا تھا' اُس نے جب دیکھا تو کہا' اے یہ تو ''مسلمانی'' پاجامہ ہے۔ وہ جماعتِ اسلامی والوں کو ڈھونڈتا ہوا آیا اور خود پاجامہ لاکر دیا اس طرح خاں صاحب کے کپڑوں کی گنتی پوری ہو گئی۔

کمیونسٹ لیڈر نے کمیونزم اور مزدوروں کے حقوق و حالات کے متعلق بات کی۔ راقم نے دعوت حق پیش کی۔ آر۔ایس۔ایس کے ذمہ دار نے صدارتی تقریر میں کہا کہ ہم ہٹلر کی قوم پرستی کو صحیح سمجھتے ہیں لیکن اس نے اپنے گرد قوم کو گھمانے کی غلطی کی، اس سے بچنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اصل سنگھ ہے فرد نہیں۔ ہم سنگھ کو شخصیتوں سے اونچا سمجھتے ہیں۔

سیاسی لیڈروں میں سے موہن دھاریہ صاحب لوگوں کی نظروں کا مرکز بنے رہتے تھے۔ اُن سے مختلف سوالات کیے جاتے۔ بی بی سی اور سرکاری خبروں پر تبصرہ ہوتا رہتا تھا۔ گرفتاریوں کی خبریں آتی رہتیں اور اندر نعرے لگائے جاتے ''اندرا تیرے کھیل کی جگہ نہیں

ہے جیل میں۔''

آر۔ایس۔ایس کی شاکھائیں جو میدانوں میں ہوتی تھیں وہ جیلوں میں بھی جاری رہیں۔ مظاہرہ ہوتا رہا۔ ہم اذان دے کر نماز با جماعت کا اہتمام کرتے تو اس کا اثر ملا جلا ہوتا۔ کچھ غیر مسلم سراہتے اور کچھ لوگ دبی زبان میں اچھا ''یہاں بھی'' کے الفاظ ادا کرتے۔

خطوط سنسر ہو کر جاتے اور آتے۔ راقم نے بھی احباب اور رشتہ داروں کو خطوط لکھے۔ پہلا خط جو اہلیہ کو لکھا اس میں درج تھا کہ اگر وہ اپنے رشتہ داروں کے یہاں جانا چاہیں تو اجازت ہے۔ وہ کچھ دنوں کے لیے گئیں اور پھر گھر واپس آ گئیں۔ اپنے معمول کے مطابق نظر بندی کے دوران بھی دین کی نصرت کی سعادت حاصل کرتی رہیں۔

یہاں سب نظر بندوں کی کچھ نہ کچھ سرگرمیاں اور دلچسپیاں تھیں۔ برادران وطن کو جیوتش میں زیادہ دلچسپی تھی، اس کے لیے سیکھنے اور سکھانے والوں کا اژدھام رہتا تھا، لیکن کچھ لوگ سنجیدہ اور اس سے نالاں بھی تھے۔ چند غیر مسلم بھائیوں نے اردو سیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا، راقم نے اس کا اہتمام کیا لیکن ۱۰، ۲۰ دن سے زیادہ کلاس نہ چل سکی۔

ایمرجنسی سے پہلے بھی ملازمین کو آر۔ایس۔ایس اور جماعت اسلامی سے ڈرایا جاتا تھا، لیکن جب یہ ایک دوسرے سے ملے تو کسی کو تعجب نہ ہوا۔

جماعت کے رفقا نے دعوتِ حق کا کام انجام دیا اور یہ خوش گمانی بھی رکھی کہ ان لوگوں کی سوچ کچھ بدلی ہوگی لیکن رہائی کے بعد کی ملاقاتوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ زیادہ فرق واقع نہیں ہوا ہے۔

آر۔ایس۔ایس کے بڑے ذمہ دار جناب بھڑے صاحب ریاست مہاراشٹر کا دورہ کرتے ہوئے ایک بار آکوٹ آئے تو رفقا نے ٹی پارٹی دی۔ اس موقعہ پر انہوں نے جن زہریلے خیالات کا اظہار کیا ان کو ایک مراسلے کی صورت میں راقم نے مرکزی ذمہ داروں کو لکھا اور یہ مراسلہ سہ روزہ دعوت، ریڈیئنس ویکلی اور ہفت روزہ کانتی میں شائع ہوا۔ ایمرجنسی کے دوران جماعت اسلامی ہند کے خلاف جو پروپیگنڈہ کیا گیا امیر جماعتِ اسلامی ہند مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم نے اس کا جواب ''یالیت قومی یعلمون'' نامی

کتاب میں دیا۔ اس کتاب میں راقم کے اس مراسلہ کا حوالہ دیا کہ ملّت کے مخالفین اپنے دلوں میں کتنا زہر رکھتے ہیں۔

ایمرجنسی اٹھائے جانے کے بعد کے یہ حالات برسبیل تذکرہ نوکِ قلم پر آ گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بندے کا جتنا ایمان ہوتا ہے اس کے لیے آزمائش بھی اسی کے مطابق آتی ہے۔ قید و بند کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے سنتِ یوسفی سے نوازا اور اس پر ثابت قدم رکھا جو شکر کا مقام ہے۔ رہائی کے بعد ملازمت سے رجوع ہوا اور نظر بندی کے دوران کی تنخواہ بھی وصول ہوئی۔

جماعت اور اس کے خادموں کا وقار بلند ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ثابت قدم رکھ کر اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دردِ دل اور بڑھے

□انعام الرحمٰن خاں
بھوپال (مدھیہ پردیش)

ایمرجنسی کے دوران جماعت پر پابندی اور قید و بند کے مراحل بظاہر سخت آزمائش تھے مگر اللہ نے اپنے فضل کے دروازے کھول دیے۔ جیلوں کے اندر غیر مسلموں میں اتنا دعوتی کام ہوا اس سے پہلے جس کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ مختلف علاقوں کے منتخب و سربرآوردہ لوگ جو اسلام اور مسلمان کے بارے میں بس اتنا جانتے تھے کہ یہ ایک قابلِ نفرت بوجھ ہے جو ہم پر لدا ہوا ہے، اتنی تعداد میں اشتیاق اور توجہ سے ہماری باتیں سننے والے ہم کو ملے جن کا تصور بھی ہم باہر کی دنیا میں نہیں رکھتے تھے۔ وہ صرف ہماری باتیں سنتے ہی نہیں تھے بلکہ اثر بھی قبول کرتے تھے۔

بھوپال سنٹرل جیل میں گرفتاری کے دو روز بعد سے ہمیں جس بیرک میں رکھا گیا اس میں شروع سے آخر تک کم و بیش پونے دو سو آدمی رہے تھے۔ اکیس تو ہم جماعتی رفقا تھے اور تقریباً اتنے ہی سیکولر ذہن کے مسلم و غیر مسلم اصحاب ہوں گے۔ باقی سوا سو جن سنگھ اور آر۔ایس۔ایس والے تھے۔ شروع میں طرفین کو یہ فکر و پریشانی رہی کہ دیکھیں یہ اجتماع الضدین کیا گل کھلاتا ہے، مگر چند ہی روز میں لوگ ایسے گھل مل گئے اور جانبین کی طرف سے رواداری کا ایسا نمونہ سامنے آیا کہ اگر جیل سے باہر کی دنیا میں ایسی رواداری کا چلن ہو جائے تو وہ بہت سے مسائل پیدا ہی نہ ہوں جنھوں نے پورے ملک کو پریشان و بدنام کر رکھا ہے۔ اس صورت حال میں باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ کھانے پینے اور دوسری آسائشوں کے

معاملہ میں تو ہم بے نیاز رہیں گے اور اپنے کو بے حس بنالیں گے لیکن اپنے اصولوں اور معاملات کی درستی کے سلسلہ میں اپنا رویہ بے لاگ اور بے لچک رکھیں گے۔ خدمت اور اچھے کاموں میں سب کے ساتھ شریک بلکہ پیش پیش رہیں گے اور اختلافی امور میں بے تعلق، چناں چہ آخر وقت تک اس کی پابندی رہی۔ بیس ماہ کی اس طویل مدت میں ایک بار بھی ہماری جانب سے کوئی شکایت یا مطالبہ نہیں ہوا، البتہ اس سلسلہ میں اکثر اوقات دشواری بھی پیش آتی تھی۔ مثلاً یہ کہ شاید کوئی ہفتہ گزرتا ہوگا جس میں ان کے کسی بڑے آدمی کی برسی نہ منائی جاتی ہو۔ ہر دس پانچ روز میں کوئی نہ کوئی برسی آجاتی تھی۔ ایسے مواقع پر اس گزری ہوئی شخصیت پر تقریریں ہوتی تھیں جن میں کبھی کبھی ہم نے بھی حصہ لیا اور اپنے نقطۂ نگاہ سے کوئی کام کی بات متوفی کے حالات زندگی میں سے نکال کر بتائی۔ مگر ہم کو دشواری اس وقت ہوتی تھی جب پورا مجمع اس شخصیت کی یاد اور احترام میں کھڑا ہو جاتا تھا اور ہم لوگ بیٹھے رہتے تھے۔ وہ بھی عجیب منظر ہوتا جو خود ہمیں انوکھا سا معلوم ہوتا کہ سارا مجمع تو کھڑا ہے اور چند لوگ ایک یہاں ایک وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ہم نے ایک سے زیادہ بار معذرت کے انداز میں وضاحت کر دی تھی کہ گزری ہوئی شخصیتوں کے احترام و تعظیم کی ایسی شکلوں سے ہی شرک کی ابتدا ہوتی ہے، جو ایک مسلمان کے لیے بڑا جرم ہے۔ پھر بھی ہمارے لیے یہ شکل کچھ تکلیف دہ ہی رہی، تاہم ہم اپنی روش پر قائم رہے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ چند ماہ کے بعد ان کے سب سے بڑے لیڈر نے ایک روز سب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے کچھ بندھوؤں کو ایسے مواقع پر کھڑے ہونا پسند نہیں ہے اس لیے یہ طریقہ ہمیں بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ چناں چہ کئی ماہ تک یہ طریقہ چھوڑے رکھا گیا، اور اگر وہ صاحب جنھوں نے یہ طریقہ بند کرایا تھا چند ماہ کے بعد دوسری جیل منتقل نہ ہو گئے ہوتے تو شاید قید و بند کے آخر تک یہ طریقہ بند رہتا— اسی طرح کھٹک پیدا کرنے والی ایک بات یہ بھی تھی کہ کھانے کے سامان میں اے کلاس اور بی کلاس والوں کے درمیان مقدار و معیار کا فرق تھا۔ ہمارے ان دوستوں میں سے آدھے کے قریب لوگوں کو اے کلاس ملا ہوا تھا اور انھوں نے طریقہ یہ رکھا تھا کہ دونوں کلاسوں کو ملا ہوا سامان ملا کر سب کو یکساں کر لیتے

تھے۔ ہمیں یہ طریقہ پسند تو بہت آیا مگر ہمارے لیے یہ دشواری تھی کہ ہم میں سے دو تین ہی آدمی اے کلاس والے تھے۔ ہم نے ان دوستوں سے بے حد اصرار کیا کہ ہماری بی کلاس کا بوجھ آپ لوگوں پر قیمتی پڑ جاتا ہے، ہمارے کھانے کا انتظام علیحدہ رہنے دیجئے۔ مگر انھوں نے ایک نہیں سنی اور جب زیادہ اصرار کیا تو ناگواری کا اظہار کیا۔ اس لیے مجبوراً انہیں کی بات ماننی پڑی۔ اس طرح الحمدللہ ہمارے اس بے ہمہ و باہمے رویہ کے نتیجہ میں ہم کو اپنے جیل کے ساتھیوں سے عزتیں بھی ملیں اور محبتیں بھی۔

ہمارا روزانہ کا پروگرام یہ تھا کہ صبح نماز کے بعد درس قرآن اور ناشتہ کے بعد ایک تربیتی طرز کا پروگرام ہوتا تھا جو اس اعتبار سے کافی مفید رہا کہ فراغتِ وقت کے باعث افادہ و استفادہ کا خوب موقعہ ملتا تھا۔ پھر ظہر کے بعد ہمارا اور غیر مسلم بھائیوں کا ملا جلا پروگرام ہوتا تھا جو مختلف موضوعات پر تقریروں اور بعض اوقات سوال و جواب پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان تمام کارروائیوں میں اس بات کی تصدیق ہوئی کہ صاف اور بے لاگ بات ہی اثر کرتی ہے۔ ہماری طرف سے شرک اور بت پرستی پر، نسل پرستی اور وطن پرستی پر اور خدا پرستی کے علاوہ کسی اور پرستی پر بغیر کسی مروت و مداہنت کے مگر حکمت کے ساتھ بے لاگ تنقیدیں ہوتیں مگر کبھی کوئی ناگواری نہیں ہوئی۔ جماعت اسلامی کے ساتھ حکومت الٰہیہ کا تصور وابستہ ہو گیا تھا اس لیے شروع ہی میں اس پر تقریر کی فرمائش ہوئی چناں چہ ایک روز اس موضوع پر تقریر اور دو روز اس پر سوالات ہوئے۔ الحمدللہ تقریر میں بھی اور جوابات میں بھی صاف صاف بات کہی گئی اور واضح طور پر مفہوم ادا کیا گیا کہ:

''یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو خود بڑھ کر اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے''

بعد میں کئی زبانوں سے یہ سنا گیا کہ اگر حکومت الٰہیہ یہ ہے تو اس کے سایہ میں رہنا ایک خوش نصیبی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک روز درس قرآن کے دوران ایک ایڈوکیٹ نے جن کا تعلق جن سنگھ سے تھا قرآن پر ایک اعتراض کیا اور میرے جواب دینے سے پہلے ایک دوسرے ایڈوکیٹ نے میری طرف سے جواب دیا۔ یہ جواب دینے والے

ایڈوکیٹ آر۔ایس۔ایس کے سنچالک ہیں اور جواب بھی اتنا صحیح تھا کہ اس سے بہتر جواب میں بھی نہیں دے سکتا تھا۔ صرف تحدیث بالنعمہ کے طور پر عرض کروں گا کہ ان سچی اور بے لاگ باتوں نے اتنا اثر کیا اور یہ باتیں کرنے والوں کے اندر اتنا وزن پیدا کیا کہ ایک بار آر۔ایس۔ایس کے دونو جوان گروہوں کے درمیان ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی اور بعد میں دونوں متحارب گروہ شکایت لے کر اپنے نیتاؤں میں سے کسی کے پاس نہیں ہمارے یہاں آئے۔

یہ تھی ہمارے اور آر۔ایس۔ایس والوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت جس کی بنیاد پر پورے ملک کی فضا میں یہ بات بھر دی گئی کہ جماعت اسلامی اور آر۔ایس۔ایس میں گٹھ جوڑ ہو گیا ہے۔ شاید ہمارے بھائی اس وقت خوش ہوتے جب انہیں جیلوں سے یہ خبریں ملتیں کہ جماعت اسلامی اور آر۔ایس۔ایس والوں کے مابین خوب گلچھپ ہو رہی ہے۔

یہ ذہن عوام ہی کا نہیں بنا بلکہ سیاسی مصلحتوں پر مبنی اس پروپیگنڈے سے خواص تک کے ذہن مسموم ہو گئے۔ چناں چہ ایک روز میں مشرقی یوپی کے ایک شہر میں ایک ایسی شخصیت سے ملا جو ملت اسلامیہ کے دو چار چوٹی کے ذی علم دانشوروں میں سے ایک ہیں۔ ابھی مصافحہ ہی ہو رہا تھا کہ انھوں نے فرمایا ''بھائی آر۔ایس۔ایس اور جماعت اسلامی کا عقد مبارک ہو۔'' میں احتراماً چند منٹ خاموش رہا مگر چوں کہ اس رکیک بہتان اور گھٹیا انداز بیان سے ناگواری ہوئی تھی، اور ناگواری بھی تہمت سے زیادہ اس بات پر کہ ہماری ملت کی اتنی بڑی شخصیت کا انداز فکر اور معیار گفتگو یہ ہے! اگر انہیں یہ بات فرمانا ہی تھی تو اس کے لیے شائستہ انداز بھی ہو سکتا تھا! چناں چہ میں نے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ ''محترم! آپ نے عقد کی خوشخبری تو سنا دی۔ ساتھ ہی یہ وضاحت اور فرما دیں کہ ان دونوں میں سے مہر کس کے ذمے ہے؟ اور اگر بگاڑ ہوا تو طلاق کا اختیار کس کو ہوگا؟'' یہ غنیمت ہے کہ یہ بات سن کر وہ جھینپ گئے۔ پھر میں نے مزید عرض کیا کہ ''میرے محترم! اگر قرآن کے چشمہ سے حالات کو دیکھا جائے تو شکل یہ نظر آئے گی کہ یہ غیر مسلم تو ہماری جانیں، جائدادیں اور

عزتیں لوٹ رہے ہیں۔ بے شک یہ ظلم ہے لیکن ہم تو ان کا وہ حق دبائے بیٹھے ہیں جو بہر حال جانوں اور مالوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ ہدایت الٰہی کے نام سے جو ان کا حق ہمارے پاس ''محفوظ'' ہے وہ ہم ان تک نہیں پہنچا رہے ہیں۔ بتائیے! ان دونوں میں سے بڑا ظلم کون سا ہوا؟ قیامت کے دن جب میرے غیر مسلم پڑوسی کا ہاتھ میرے گریبان پر ہوگا اور وہ فریاد کر رہا ہوگا کہ بار الٰہ! نہ میں نے تجھے پہچانا نہ تیری بندگی کی، بے شک میں سزا کا مستحق ہوں، لیکن مجھ سے پہلے میرے اس مسلمان پڑوسی کو پکڑ جو سب کچھ جانتا تھا مگر اس نے مجھے نہیں بتایا۔ تو میرے قابل احترام رہنما! مجھے وہ جواب بتا دیجئے جو میں روز قیامت اپنے غیر مسلم پڑوسی کو دے سکوں۔ اگر نہیں تو پھر یہ فرمایئے کہ جب ہم جیسے ٹوٹے پھوٹے لوگ اس جواب دہی سے بچنے کے لیے اپنے غیر مسلم بھائیوں تک ان کا حق، پیغامِ حق پہنچانے کی کوشش کریں اور آپ جیسی عظیم بلند پایہ ہستیوں کی طرف سے گویا فرض کفایہ انجام دیں تو آپ جیسی عظیم شخصیت اس پر بھپتیاں کسے! مرا رسد کہ رسانم بر آسماں فریاد۔ انما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ۔

مختصر یہ کہ ہمارے کام اور رویہ کا رخ یہ رہا جس کا انتہائی مختصر خلاصہ اوپر بیان ہوا، اور اس طویل عرصہ میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہوئی جو اپنے غیر مسلم ساتھیوں سے یا جیل کے اسٹاف سے اختلاف کی بات کہی جا سکے۔

اپنے اور اپنے رفیقوں کے بارے میں یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ سب کا رویہ معیاری رہا، البتہ خدا کے فضل سے اتنا ضرور ہوا کہ غیر مسلم لیڈر اپنے پیروؤں کے سامنے ہمارے رویہ کو مثال اور نمونہ کے طور پر پیش کرتے رہے۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ہم سب نے یکساں طور پر وقت کا صحیح استعمال کیا، البتہ خدا کے فضل سے وقت کو بالکل برباد نہیں کیا۔ ہم سب کی شدید خواہش رہی اور یہی دعائیں کرتے رہے کہ جماعت جب بحال ہو تو ایسا محسوس ہو کہ ایک مشین چلتے چلتے رک گئی تھی جو بٹن دباتے ہی پھر چلنے لگی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عاجزانہ دعائیں قبول ہوئیں، اور اب ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ اس عظیم بخشائش کا شکر عمل کی زبان سے ادا کریں۔

اس سلسلہ کی ایک اور بات قابل شکر یہ ہے کہ اس مدت میں ہم کو اس حقیقت کا عملی تجربہ ہوا کہ اگر آدمی اپنے آپ کو واقعی پہچاننا چاہتا ہے تو یہ آزمائش اس کے لیے ایک زریں موقعہ ثابت ہوسکتی ہے۔ نارمل حالات میں تو آدمی کپڑے پہنے رہتا ہے، مگر آزمائشوں کے جھکڑ اس کے اندرون کو کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر خود احتسابی کی طاقت ہو تو خود اس کے سامنے اس کی حقیقی شخصیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ یہی صورت حال ہم کو پیش آئی۔ ہم میں سے جن کے اندر ذکاوتِ حس کا مادہ پہلے سے تھا وہ جیل کے اندر اور بڑھ گیا اور وہ اپنے رفیقوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو برداشت نہیں کر سکے۔ جن لوگوں کو اپنی اصابت رائے پر اعتماد تھا وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مورچہ لگا کر اپنے صائب الرائے ہونے کا ثبوت دیتے رہے۔

(اقتباس از مکتوب بنام اہلیہ ام نعیم)

یہ اللہ کا فضل ہے کہ یہاں آنے کے بعد شروع سے اب تک مجھے اپنے ایمان میں کمزوری محسوس نہیں ہوئی۔ ایک پسندیدہ خواہش کے طور پر میں یہ سوچتا رہا کہ اگر میں یہیں سے رخصت ہو جاؤں تو گویا یہ اپنی ڈیوٹی پر سے رخصت ہوگی اور یہ ایسی سعادت ہوگی جو میرے جیسے ناکارہ بندہ کے حوصلہ سے بھی زیادہ ہوگی۔ بس بیڑا ہی پار لگ جائے گا۔ یہ بھی سوچتا رہا کہ اگر اس قید و بند کو اللہ اپنے فضل سے اپنے راستہ کے مرحلوں میں شمار کر لے تو یہ بھی بڑی ہی خوش نصیبی ہوگی۔ پھر تو چاہے زمین سب سیلنگ میں نکل جائے، مکان بھی نہ رہے تو کوئی گھاٹے کی بات نہیں۔ بس تم خوش دلی سے ساتھ دو۔ ٹھیلہ چلا کر بھی گزر بسر ہو جائے گی۔ دنیا والے کچھ روز ہنسیں گے، مگر کب تک؟ عمر کا تھوڑا بہت جتنا حصہ باقی ہے اسی طرح ہنستے ہنستے گزر جائے گا۔ پھر آخرت میں تو مزے ہی مزے ہیں۔ ان شاء اللہ۔

(اقتباس از مکتوب بنام اہلیہ ام نعیم)

۷ر جولائی کو جب ہم بیرک ۳ سے اس بیرک میں آئے تو ہمارا استقبال نہایت درجہ محبت و تپاک سے لیکن ایک عجیب مخلوق کی حیثیت سے کیا گیا۔ ایک ایک ادا سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا جا رہا ہے۔ ''ایسے ہوتے ہیں جماعت اسلامی والے''

دوسرے دن جب میں نے تقریر کی تو سب کے سب گویا ہمہ تن گوش تھے کہ دیکھیں یہ عجیب مخلوق کیا کہتی ہے۔ لیکن الحمدللہ! دوران تقریر دو تین بار تالیوں سے ''سواگت'' کیا گیا اور لطف یہ کہ میں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر صاف صاف باتیں کہیں۔ پھر دو ایک دن کے بعد مجھ سے فرمائش کر کے حکومت الٰہیہ پر بلوایا گیا۔ ایک گھنٹہ تقریر ہوئی۔ یہ بھی بالکل بے لاگ تھی۔ مثلاً اس سوال کا جواب کہ ''یہاں کے پوروجوں کو آپ مانتے ہیں یا نہیں'' یا یہ کہ ''اگر ہندوستان و پاکستان میں لڑائی ہوئی تو آپ کا کیا رویہ ہوگا'' اللہ کے فضل سے ایسے سوال کا جواب بالکل کھرا، بیباک اور سوال کرنے والے کو شرمندہ کرنے والا ہو گیا۔ اس طرح کے تین چار پروگراموں کے بعد تو ان میں کے نہایت کٹر لیکن سمجھ دار لوگ کہنے لگے ''افسوس! ہم لوگ آپ کے بارے میں بڑی غلط فہمی میں تھے، آپ لوگ تو بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی ہم سب کا رویہ بھی نہایت باوقار اور بے نیازانہ تھا۔ اس کا بھی بہت اثر ہوا۔ ان کے سب سے بڑے لیڈر کو شابھاؤ ٹھاکرے جو کل ہند سطح کے لیڈر ہیں، یورپ و امریکہ وغیرہ کا دورہ بھی کر آئے ہیں بہت سمجھ دار اور خوب آدمی ہیں۔ انھوں نے تو کئی بار اپنے کارکنوں کے سامنے ہمارا نمونہ پیش کر کے انہیں غیرت دلائی۔ یہ ٹھاکرے صاحب ایک بھوک ہڑتال کے نتیجہ میں اب بیگم گنج چلے گئے ہیں۔ وہاں سے خطوط میں خلیل کا ذکر کرتے ہیں۔ اس بچہ میں بھی خدا کے فضل سے دلوں کو موہ لینے کی صلاحیت ہے جس روز وہ جا رہے تھے تو انہیں رخصت کرتے ہوئے سب اپنے اپنے رنگ میں افسوس ظاہر کر رہے تھے۔ خلیل خاں ایک خاص انداز سے منہ بنا کر بولے ''آپ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے'' اس مختصر فقرہ میں اس نے بہت کچھ کہہ دیا۔ انہوں نے بھی لپٹا لیا!

ہاں تو ان سب چیزوں کے نتیجہ میں ہم کو یہاں ایسی عزتیں اور محبتیں ملی ہیں جن کا تصور بھی باہر نہیں کیا جا سکتا تھا اور اب مجھے یہ فکر ہو رہی ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد ان تعلقات کو ہم نباہ کیسے سکیں گے؟ اور خدا کے فضل سے یہ اعتماد اتنا بڑھا ہے کہ ان کے باہمی جھگڑے کئی بار تصفیہ کے لیے ہمارے پاس آئے۔ مختصر یہ کہ یہاں ہم کو بعض وہ لطف ملے جو باہر نہیں ملتے ہیں۔

(اقتباس از مکتوب بنام اہلیہ ام نعیم)

الحمدللہ شکر وسرشاری کی کیفیت بحالی ہوئی۔ ہماری بیرک میں شروع سے اب تک کم و بیش پونے دوسو آدمی رہے ہیں۔ ان میں سے سو سے زائد جن سنگھ اور آر۔ایس۔ایس والے ہیں اور بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ اپنے اپنے علاقہ میں ممتاز ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان ایسے محبت کے تعلقات قائم ہوگئے ہیں کہ اس سے پہلے ہم خود یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔شروع میں دوتین روز تو ہم نے ان کو اور انھوں نے ہم کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ان کی طرف سے فرمائش ہوئی کہ اسلامی حکومت کی وضاحت کرو۔ میں نے ایک تقریر اس موضوع پر کی۔ پھر دو روز اسی پر سوالات کے لیے رکھے گئے۔ بہت سے سوالات تحریری و زبانی آئے۔ نتیجہ میں کئی اصحاب کا یہ تاثر سامنے آیا کہ اگر اسلامی حکومت یہی ہے تو اس پر کس کو اعتراض ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہم نے غور کر کے اپنے لیے یہ طریقہ تجویز کیا کہ ہم کھانے پینے اور آرام و آسائش کے معاملہ میں اپنے کو بالکل بے حس بنالیں گے لیکن اصول وعقائد کے معاملہ میں اپنے موقف پر قائم رہیں گے چناں چہ تقریروں میں شرک پر، بت پرستی پر، قوم پرستی پر وطن پرستی پر اور دنیا پرستی پر صاف لیکن حکمت کے ساتھ تنقیدیں ہوئیں اور نہایت ہی بے لاگ طریقہ سے توحید ورسالت وآخرت کی دعوت ہی نہیں پیش کی گئی بلکہ اسلام کے سیاسی نظام اور خلافت کی تشریح اور اس کی برکات کی وضاحت بھی کی گئی۔ اس صاف بیانی کے باوجود نہ صرف یہ کہ انھوں نے ان باتوں کی قدر کی بلکہ اس بات پر مسرت کا بار بار اظہار کیا۔ بہر حال ہمارے ایک جگہ جمع ہوجانے سے وہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں جن کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اتنا ہی نہیں اس سے بڑا خدا کا یہ فضل ہے کہ لیڈروں نے اپنے پیروؤں کے سامنے ہمیں بطور نمونہ پیش کیا۔ اس بات کا اس سے اندازہ کرو کہ وسط نومبر تک روزانہ مجلس کی صدارت ایک ممتاز لیڈر کرتے تھے، مجلس میں مختلف موضوعات پر تقریریں ہوتی ہیں۔ یہ صاحب اس حیثیت کے آدمی ہیں کہ ان کی سزائے موت بدلوانے کے لیے مسٹر گاندھی نے مرن برت رکھا تھا۔ کچھ دنوں تک پارلیمنٹ کے ممبر رہے ہیں۔ وسط نومبر کو ان کو بیگم گنج جیل بھیج دیا گیا، اس کے بعد یہ لوگ جبراً مجھ سے صدارت کرا رہے ہیں۔ جس کا ایک فائدہ یہ سامنے آیا کہ صدر کی حیثیت سے بعض وہ باتیں کرنے کا موقع ملا

جو اس کے بغیر نہیں مل سکتا تھا۔

بہر حال مجھے امید ہے کہ غیر مسلم بھائیوں میں دعوت حق پہنچانے کی راہیں کھلیں گی کیوں کہ تقریباً یہ سب کے سب اپنے اپنے علاقہ میں اثرات رکھتے ہیں اور اتنے دنوں کی یکجائی کے نتیجہ میں ان کے اندر اسلام کے بارے میں اچھی رائے کے ساتھ تلاش و تجسس کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک معمولی سی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں کی تقریروں اور مشاعروں اور بیت بازی نے ان میں سے کچھ افراد کو اردو سیکھنے کا شوق پیدا کیا، ان میں سے بعض نے تو ایسی حیرت انگیز صلاحیت کا ثبوت دیا کہ ہفتہ عشرہ کی ہی محنت کے بعد اٹک اٹک کر اردو اخبار پڑھنے لگے۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اسلام اور مسلمان کی نمائندگی کا شرف اور "غرھولا دینھم" کے خطاب کی عزت ہم جیسے حقیر نہایت معمولی حیثیت والوں کو ملی ہے جن میں کوئی ہل چلانے والا ہے کوئی بیڑی بنانے والا اور کوئی کپڑے سینے والا۔ اب اگر یہ خوش فہمی نہیں ہے کہ واقعی یہ سعادت ہم جیسے حقیر لوگوں کو بخشی گئی ہے تو کیا یہ کسی بڑی آزمائش کا باعث نہ ہوگی۔ یہ نعمت اُسی وقت نعمت ہوگی جب کہ ہم حق کے لیے کھل جانے والے دروازوں میں گھس جانے کی توفیق سے بھی نوازے جائیں ورنہ پیر پھیلا کر سو جانے کی صورت میں تو خدا کی نعمتیں بھی مصیبتیں بن جاتی ہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جماعت کے قانونی طور پر ختم ہو جانے کے بعد آزمائش اور سخت ہوگئی ہے۔ ایک رفیق جماعت کے الفاظ میں جماعت اگر دردِ سر تھی تو اس سے نجات مل گئی اور اگر دردِ دل تھی تو یہ درد اور بڑھ جانا چاہیے۔ خدا کرے ہم سب کے لیے یہ دردِ دل ثابت ہو۔

(اقتباس از مکتوب بنام اہلیہ ام نعیم)

مکتوب بنام وزیر اعلیٰ

بخدمت جناب محترم چیف منسٹر صاحب، مدھیہ پردیش، بھوپال

معرفت سپرنٹنڈنٹ صاحب، سنٹرل جیل، بھوپال

مضمون: ممنوعہ جماعت اسلامی اور متعلقہ گرفتار شدگان کے بارے میں۔

جناب محترم! آداب

عرض مدعا سے پہلے اپنا تعارف ضروری سمجھتا ہوں۔

میرا نام انعام الرحمٰن ہے۔ میں ۴؍جولائی ۷۵ء تک جب کہ جماعت اسلامی پر بین لگایا گیا ہے جماعت کا ممبر، جماعت اسلامی مدھیہ پردیش کا پریسیڈنٹ اور جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن (سنٹرل ورکنگ کمیٹی کا ممبر) تھا۔

اس مختصر تعارف کے بعد بینڈ جماعت اسلامی اور اپنے تعلق سے جناب کی توجہ کے لائق کچھ باتیں پیش کر رہا ہوں:

۱۔ جماعت اسلامی ایک دینی جماعت تھی۔ وہ اہل وطن کی ذہنی وفکری اور علمی اصلاح کے ذریعہ وطن کی خدمت کر رہی تھی۔ اس کے لیے اس نے وسیع اصلاحی اور تعمیری لٹریچر تیار کیا تھا جو قومی اور ملک کی تمام علاقائی زبانوں میں پھیلا ہوا اور مقبول ہے۔ یہ لٹریچر فکری وعملی اصلاح کا کام کر رہا تھا، جسے دیکھ کر جماعت کے فکر اور اس کی پکار کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ جماعت اپنے لٹریچر، تقریروں، اجتماعات اور سمپوزیم وغیرہ کے ذریعہ اپنے ہم وطنوں کو بلا امتیاز مذہب وملت خدا کی بندگی اور اخلاقی اصلاح کی تعلیم دیتی تھی اور فرقہ واریت، توڑ پھوڑ، فتنہ وفساد، بلیک مارکٹنگ اور بھرشٹا چار وغیرہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی چیزوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کرتی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ سب کام کھلے عام اور پُر امن فضا میں ہی ہو سکتے ہیں۔ دستور کی پابندی ملکی مفاد کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ خود اپنے تعمیری کام کی مصلحت اور اسلامی تعلیمات کے تقاضے کے طور پر بھی جماعت کے لیے ضروری رہا ہے کہ پر امن حالات پیدا کرنے اور قائم رکھنے میں وہ اپنی تمام کوششیں صرف کر دے، چناں چہ وہ یہی کرتی رہی اور پوری اٹھائیس سال کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو پیار اور محبت کے ساتھ لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کے طریقہ سے ذرا بھی ہٹا ہوا ہو۔

حالات کا پر امن اور فضا کا پر سکون رہنا جماعت کے پیغام کا لازمی طریقہ کار ہے، اس لیے جماعت کے ہم خیال اخبار 'دعوت' دہلی کی فائلیں دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس اخبار نے اور پوری جماعت نے دستوری طریقوں سے ہٹی ہوئی اور اخلاقی معیار سے گری ہوئی ہر کارروائی کے خلاف لوگوں کا ذہن بنانے کی کس قدر کوششیں کی ہیں۔

اسی نقطہ نظر سے جماعت اسلامی کے امیر نے حالات کے بگاڑ کو تشویش کی نظر سے دیکھا اور سدھار کی ضرورت شدت سے محسوس کر کے نومبر ۷۴ء میں دہلی کے آل انڈیا اجتماع میں، جس میں بیرونی ممالک کے نمائندے بھی کافی تعداد میں شریک تھے، اپنے خطبہ صدارت میں بھی اور تقریروں میں بھی ملک میں ہونے والی شورش پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس کی مذمت کی اور حکومت کو بھی توجہ دلائی اور اپنے کارکنوں کو بھی ہدایات دیں کہ وہ فضا کو پر امن بنانے کے لیے پوری کوششیں صرف کر دیں۔ امیر جماعت کے ان بیانات کو ملکی پریس نے بھی اہمیت دی اور آل انڈیا ریڈیو نے بھی نشر کیا۔

جماعت اسلامی کا یہ تعارف کہ وہ فرقہ واریت اور ہر قسم کی شر انگیزی کو دور کرنے اور بھائی چارہ اور جمہوری اقدار کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کو جاننے والا ہر شہری اس کی شہادت دے گا۔ یہ اس کا امتیازی مقام ہے۔ سیلاب زدہ اور قحط زدہ علاقوں کی بلا امتیاز خدمات میں بھی نمایاں رہا ہے۔ ان امدادی خدمات کے دوران لوگوں کے درمیان میل ملاپ پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں بھی کی گئیں اور علاقے کے علاقے منہ بولتے گواہ ہیں کہ جہاں بھی جماعت نے ریلیف کے طور پر خدمت خلق کا کام انجام دیا وہاں لوگوں میں میل ملاپ پیدا ہوا اور حالات پر سکون ہو گئے۔ خود مدھیہ پردیش ہی کے جبل پور، ساگر، نرسنگھ پور، بھوپال، رائے گڑھ، دھرم جے گڑھ، ودشہ اور اندور وغیرہ مقامات اس بات کے گواہ ہیں۔ اور جہاں تک گجرات کا تعلق ہے تو جماعت کی خصوصیت اور وہاں کی امدادی خدمات کا اعتراف تو حکومت کے اعلیٰ ذمہ داروں تک نے کیا ہے جسے اخبارات کی فائلوں میں دیکھا جا سکتا ہے، مثلاً گجرات کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ مسٹر ہتیندر ڈیسائی اور وہاں کے گورنر نے جماعت کی نئی تعمیر کردہ بستی ملت نگر کو اور اس کی دوسری تعمیری اور امدادی خدمات کو اور اس کے پیدا کردہ بھائی چارہ کے مناظر کو غور سے اور تفصیل سے دیکھ کر جماعت کی خدمات کو سراہتے ہوئے حوصلہ افزائی کی۔

ملک کے امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر جماعت کو سخت تشویش تھی، وہ ان دو بیانات سے بھی ظاہر ہے جو ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد ہی امیر جماعت نے دیے تھے

اور جو اخبار دعوت میں شائع ہو چکے ہیں۔

۲۔ ان حقائق کی موجودگی میں اور حالات و واقعات کی روشنی میں صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ ملک کے ہر واقف کار اور امن پسند شہری کے لیے بھی باعثِ تعجب ہے کہ وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے جماعت پر بین (Ban) لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ اور اگر فی الواقع حکمراں پارٹی کی یہ ایک انتخابی ضرورت تھی کہ فرقہ وارانہ بیلنس برقرار رکھا جائے تو یہ بات کسی معمولی درجہ کی ذمہ دار حکومت کے بھی شایان شان نہیں کہی جاسکتی۔ مورخ نہایت درجہ افسوس کے ساتھ یہ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ ۷۵ء میں جب کہ ملک کو بے لوث خدمت کرنے والوں کی شدید ضرورت تھی ملک کو اپنی نوعیت کی اس منفرد جماعت کی بھلائیوں اور خدمات سے محروم کر دیا گیا جو اپنے ایمان کے تقاضے اور اپنے خالق کی خوشنودی کے لیے بے لوث خدمات انجام دے رہی تھی۔

۳۔ جماعت کے کچھ ذمہ داروں اور ارکان کو تو جماعت پر بین لگانے کے اعلان سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا اور باقی کو فوراً بعد۔ اور اگرچہ ڈیٹینشن آرڈر میں کوئی بات بتائی نہیں گئی لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ جماعت سے تعلق کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے، کیوں کہ ہم اپنے جماعتی مسلک کی وجہ سے ہی نہ تو کسی انتخابی کارروائی میں حصہ لیتے تھے اور نہ جلوسوں کے ہنگاموں میں۔ اور ان چیزوں کا تو ہمارے تعلق سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جن کی روک تھام کے لیے دراصل میسا کا قانون بنایا گیا ہے۔ ہمارے انفرادی اور اجتماعی عمل میں بناؤ کے کام تو بہت سے دیکھے جاسکتے ہیں لیکن امن کو بگاڑنے والی کسی کارروائی کا کوئی شائبہ بھی نہیں دیکھا جاسکتا۔

۴۔ تاریخ کا یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے کہ حکمراں طاقت نے خیر خواہوں کو بدخواہ سمجھا ہو۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ حکمرانوں نے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر دوستوں کو دشمن اور سچائی کے ساتھ بے لوث خدمت کرنے والوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھا ہے، پھر جب حقیقی صورت حال سامنے آئی تو اس وقت اپنی غلط کارروائی سے پہنچے ہوئے نقصانات پر کف افسوس ملنے کے سوا کچھ نہ کیا جاسکا۔

اس نسخہ کا استعمال اگر چہ اس زمانہ میں عام ہے کہ ''کتے کو پہلے پاگل قرار دو پھر گولی مار دو'' لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ''زیادہ آدمیوں کو تھوڑے دن اور تھوڑے آدمیوں کو زیادہ دن اندھیرے میں رکھا جا سکتا ہے لیکن سب آدمیوں کو ہمیشہ اندھیرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔'' اگر حکمراں جماعت حقیقت پسندی کو اپنے لیے مفید سمجھتی ہو تو یہ بات خود اس کی انتخابی مصلحت کے حق میں جاتی ہے کہ وہ اس بات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کہ جماعت کے خلاف حکومت کی اس کارروائی کا ملک کی رائے عامہ نے اور خصوصاً مسلم رائے عامہ نے کیا اثر لیا ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس رائے عامہ کو صحیح طور پر جانچنے کا بیرومیٹر کچھ ہاں میں ہاں ملانے والے اور سہمے ہوئے عناصر نہیں، نہ چند وہ بڑے لوگ ہیں جن کی رسائی ایوان حکومت تک ہے، بلکہ اس کے پیمانے دوسرے ہیں۔

۵۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جماعت کے خلاف حکومت کے اس قدم سے اس کی آواز کو اور طاقت ملے گی، کیوں کہ وہ ہر شریف و امن پسند شہری کے دل کی آواز ہے—

۶۔ میں نہیں کہتا کہ میری باتوں کو صرف میرے کہنے پر صحیح مان لیا جائے لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ یہ کلمات پوری طرح غور و توجہ کے مستحق ہیں۔ حق و انصاف کا نہیں حکومت کے خود اپنے مصالح کا اور ملک کے مفاد کا تقاضا ہے کہ حکومت کے ذمہ دار اصحاب ان امور پر توجہ فرمائیں۔ اور اگر اپنی اس کارروائی کو جو جماعت اسلامی اور اس کے افراد کے خلاف کی گئی ہے حقائق کی روشنی میں غلط پائیں تو پہلی فرصت میں اس کی تلافی کریں۔

مجھے امید ہے کہ آں جناب خود بھی ان چیزوں پر غور فرمائیں گے اور پردھان منتری کی توجہ بھی ان کی جانب مبذول کرائیں گے اور مجھے بھی جواب مرحمت فرمایا جائے گا۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

مکتوب بنام وزیر اعظم

بخدمت جناب پرائم منسٹر حکومت ہند

معرفت: سپرنٹنڈنٹ صاحب سنٹرل جیل، بھوپال

مضمون: جماعت اسلامی ہند (ممنوعہ) کے اور اپنی گرفتاری و رہائی کے بارے میں۔

جناب محترمہ! آداب

میرا نام انعام الرحمٰن ہے۔ بھوپال (مدھیہ پردیش) کا رہنے والا ہوں۔ ۴؍جولائی ۷۴ء تک جب کہ جماعت اسلامی پر پابندی لگائی گئی میں اس کا ممبر تھا اور ۴؍جولائی سے ہی میسا کے تحت سنٹرل جیل بھوپال میں نظر بند ہوں۔

پچھلے دنوں مرکزی وزیر داخلہ نے فرمایا تھا کہ نظر بندوں کو اپنا معاملہ حکومت کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ اس ارشاد کی روشنی میں ۳؍مارچ ۷۶ء کو اپنا معاملہ میں وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔ اب براہ راست جناب کی خدمت میں اس مجبوری سے اردو زبان میں پیش کر رہا ہوں کہ میں انگریزی اور ہندی میں نہیں لکھ سکتا:

۱۔ میرے ڈیٹینشن آرڈر میں گرفتاری کی کوئی متعین وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔ مگر میں ایسا سمجھنے میں شاید صحیح ہوں کہ مجھے جماعت اسلامی سے تعلق ہی کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے اس لیے جماعت کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔

۲۔ ملک کا ہر واقفِ حال آدمی جانتا ہے کہ جماعت اسلامی فرقہ پرستی، شور وشغف، توڑ پھوڑ اور لاقانونیت کی مخالف اور اللہ کی بندگی کا پرچار کرنے والی جماعت تھی۔ اس کی رائے میں اخلاقی سدھار بھی اللہ کی سچی اور پوری بندگی سے ہی ہوتا ہے۔ اور اسی سے سیرت کی تعمیر اور قانون کی پابندی بھی ہوتی ہے۔ اس مقصد کے تحت وہ مختلف طریقوں سے ملک اور اہل ملک کی خدمت کر رہی تھی۔ اسی غرض سے اس نے وسیع لٹریچر تیار کیا جس سے ملک کی بیشتر زبانوں میں ذہنی وفکری اصلاح کا کام کیا جا رہا تھا۔ وہ کھلے عام اجتماعات کرتی تھی۔ مختلف موضوعات ومسائل پر سمپوزیم کا انتظام کرتی تھی جس میں ہر خیال کے لوگ حصہ لیتے تھے۔ انتخابات کی سیاست میں اس نے کبھی کوئی حصہ نہیں لیا، البتہ اس کا یہ کام ضرور تھا کہ ملک کے کسی حصہ میں کہیں سیلاب آیا یا قحط پڑا یا فساد ہوا تو اس کے کارکن مصیبت زدہ لوگوں کو ریلیف پہنچانے کے لیے موقع پر پہنچ گئے۔ اس کے پروگرام میں یہ بات بھی اہمیت کے ساتھ شامل تھی کہ ملک کے ہر حصہ میں جہاں ممکن ہو کچھ بستیاں اور محلے منتخب کر کے انہیں ہر اعتبار سے نمونہ بنانے کی خدمت انجام دی جائے۔ بہت سے غیر مسلم بھی

اس کے معاون تھے۔ اس کے کام اور پیغام کی سب سے نمایاں فرضیت یہ تھی کہ ایمان و اخلاق کی روح انسان کے برتاؤ میں، معاملات میں، سیاست میں، معاشرت میں، معیشت میں غرض یہ کہ ہر اس کام میں داخل ہو جائے جو انسان اس دنیا میں کرتا ہے۔ اس کا لٹریچر، اس کی تحریر، اس کی تقریریں اس کے خدمت خلق کے پروگرام غرض یہ کہ اس کی تمام کوششوں کا مرکز و محور یہ چیز تھی کہ ہر انسان خدا کا فرماں بردار شریف بندہ اور انسانیت کا بہی خواہ بن کر رہے، اس سے جو معاملہ بھی کسی دوسرے شخص کو پیش آئے تو وہ ایک پابندِ قانون انسان اور اخلاص و محبت کا پتلا ثابت ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کام خود اپنی ضرورت سے بھی انس اور محبت و میل ملاپ کی فضا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت لاقانونیت اور جھگڑے فساد کی سخت مخالف تھی اور لوگوں کا یہ مزاج بنانے میں لگی ہوئی تھی کہ گویا حضرت مسیحؑ کے الفاظ میں ''اگر کوئی کرتا مانگے تو اسے چوغہ بھی دے دو'' اس بات کی شہادت وہ بے شمار انسان دیں گے جو اس سے واقف ہیں۔ اس کی شہادت نومبر ۷۴ء میں دہلی کے آل انڈیا اجتماع کی کارروائیاں دیں گی جنہیں ملکی پریس بھی شائع کرتا رہا اور آل انڈیا ریڈیو بھی نشر کرتا رہا۔ اس کی شہادت ملک کے اندر اور باہر کے وہ ہزاروں معززین دیں گے جنھوں نے دہلی کے مذکورہ اجتماع میں جماعت کو اندر سے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے شرکت کی تھی۔ اس کی شہادت گجرات کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر ہتیندر ڈیسائی اور اس کے گورنر دیں گے جنھوں نے فساداتِ گجرات کے بعد جماعت کی جانب سے تعمیری خدمات کو تفصیل سے دیکھ کر اس کی تعریف و حوصلہ افزائی کی تھی۔ مختصر یہ کہ ملک کے تقریباً ہر حصہ میں ہوئی جماعت کی بے غرض خدمات کی چھاپ اس بات کی شہادت دے گی کہ یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے۔

انہیں وجوہ سے خیال ہوتا ہے کہ خدا کی مخلوق کو خدا کا کنبہ سمجھ کر ان کی مخلصانہ خدمت کرنے والی اس جماعت کے اور اس کے ممبران کے خلاف یہ غلط کارروائی کسی غلط فہمی کی بنا پر کی گئی ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ حکومت اس جماعت کا اور اس کے پیغام اور کام کا ازسرِ نو جائزہ لے اور دیکھے کہ جماعت کے ساتھ جو سلوک اس نے کیا وہ حق و انصاف پر مبنی

ہے یا نہیں۔ یعنی اگر حکومت سب کچھ جانتے ہوئے بھی بے خبر ہے اور جماعت کے بارے میں اس کا یہ فیصلہ توازن و بیلنس جیسی اپنی کسی سیاسی مصلحت پر مبنی ہے تو میں نہایت ادب و اخلاص کے ساتھ یاد دلاؤں گا کہ یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے۔ اقتدار کی تاریخ گواہ ہے کہ اس نے کبھی تاریخ کے تلخ تجربات سے سبق نہیں لیا اور اکثر اوقات خود اسے اپنی خود فراموشی کا نقصان اٹھانا پڑا۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ کے ہاتھوں تاریخ میں ایک اور تلخ و دردناک تجربہ کا اضافہ نہ ہو.....

ایمرجنسی کی سیاہ راتیں

❑ محمد ظہیر عالم فلاحی
سیونی (ایم۔پی) حال مقیم الہ آباد

جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ سے فراغت کے بعد ہی الحمدللہ مجھے جماعت اسلامی کی رکنیت حاصل ہوگئی تھی، اور محترم مولانا نظام الدین اصلاحی امیر حلقہ مدھیہ پردیش کی ہدایت پر سیونی (مدھیہ پردیش) پہنچا تھا۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی تھی۔ سیونی سے پہلی بار واپسی کے بعد قصبہ منڈیا ہوں میں شادی ہوگئی۔ ایمرجنسی سے قبل میں درسگاہ میں ایک معلم کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ وہاں سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی میرا قیام سیونی میں ہی رہا۔ میری اہلیہ بچے کو لیکر ایمرجنسی سے کچھ ماہ قبل منڈیا ہوں واپس آچکی تھیں۔

اندرا گاندھی کے خلاف الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ کے نتیجہ میں ملک کے حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے تھے۔ نوبت بایں جا رسید کہ ۲۵۔۲۶ جون ۷۵ء کی درمیانی شب میں ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی گئی۔ لوگوں کے بنیادی حقوق سلب کرلیے گئے۔ عدلیہ گویا بے دست و پا ہوکر رہ گئی۔ پارلیمنٹ وزیراعظم اندرا گاندھی کی تابع ہو گئی۔ کئی تنظیموں کے ساتھ اسلامی فکر کی حامل تنظیم جماعت اسلامی ہند پر بھی پابندی عاید کردی گئی۔ وابستگان تحریک کو پابند سلاسل کردیا گیا۔ پورے ملک میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا ہوگیا تھا۔

میں ۳؍جولائی کو رات میں منڈیا ہوں سے سیونی پہنچا۔ ۴؍جولائی کی صبح اطلاع ملی کہ جناب حاجی کشف الدجیٰ خاں گرفتار کرلیے گئے ہیں۔ جناب عبدالاحد خاں کو تھانہ بلایا

گیا ہے۔ میں جمعہ کی نماز پڑھ کر باہر نکلا ہی تھا کہ پولیس کی گاڑی ٹھیک میرے پیچھے آکر کھڑی ہوئی۔ شناخت کے بعد مجھے جیپ میں بٹھالیا گیا۔ اندر دیکھا کہ جناب عبدالاحد خاں بھی بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر سیونی تھانہ میں روک کر کچھ کاغذی کارروائی ہوئی، اس کے بعد ہم لوگ چھندواڑہ جیل بھیج دئے گئے، جہاں دھیرے دھیرے تحریکی رفقا کی تعداد بڑھتی گئی، جن میں حاجی کشف الدجیٰ خاں، جناب احمد علی، جناب محمد نعیم صاحب، عبداللطیف صاحب سیونی، اور محمد طاہر خاں چھندواڑہ شامل تھے۔ تقریباً ۶ ماہ بعد میرا چھوٹا بھائی محمد ضمیر عالم جو نپورٹی بی ہاسپٹل سے گرفتار کرلیا گیا جہاں میرے والد زیر علاج تھے، اسے مجھ سے الگ سیونی جیل میں رکھا گیا۔ جیل میں جماعت کے علاوہ آر۔ایس۔ایس، آنند مارگ، C.P.M. اور سرودودیہ تحریک سے وابستہ افراد تھے۔

اندازہ کیا جارہا تھا کہ پہلی سہ ماہی میں شاید ایمرجنسی ختم ہوجائے اور رہائی ہوجائے مگر بعد میں نظر آنے لگا کہ شب تاریک طویل ہوسکتی ہے۔ چناں چہ اصحاب سجن کے لیے پروگرام ترتیب دیا گیا۔ پہلی ترجیح یہ تھی کہ صبر اور توکل پیدا ہو۔ اسکے لیے ذاتی مطالعہ قرآن وحدیث پر توجہ دی گئی۔ درس قرآن کے ذریعہ راہ حق پر جمنے، مصائب اور ابتلا و آزمائش میں ثابت قدمی، سنگین حالات کے مقابلہ کے لیے ابھارا جاتا رہا۔ معافی نامہ سے بچنے کی تلقین کی جاتی رہی، اوقاتِ نماز میں خطاب کے ذریعہ نصب العین کی اہمیت، اس کے لیے ایثار وقربانی، ثابت قدمی، توبہ واستغفار اور نمازوں کے اہتمام پر توجہ دلائی جاتی رہی۔ الحمدللہ خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوا۔ بلند حوصلگی، اولوالعزمی پیدا ہوئی۔ تلاوت اور حفظ قرآن کا اہتمام کیا گیا۔ دوسری جماعتوں کے افراد سے انفرادی ملاقات، کبھی کبھی درس قرآن، کسی اجتماعی پروگرام کے وقت خطاب، مختلف عنوانات کے تحت ہونے والے پروگراموں میں شرکت وخطاب اور اردو کلاسیز کا سلسلہ جاری رہا۔

۲۰ سے زائد افراد نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا۔ مولانا سید حامد علی صاحب کی کئی کتابوں (توحید۔ توحید کے اثرات زندگی پر وغیرہ) کو سبقاً سبقاً پڑھایا گیا۔ ایک میجر صاحب نے قرآن مجید پڑھنا شروع کردیا تھا، کئی پارے پڑھ چکے تھے۔ بعض لوگوں کے دباؤ کی وجہ

سے اگرچہ یہ سلسلہ بند کر دیا لیکن جب بھی ملتے افسوس کا اظہار کرتے۔

گرفتاری کے وقت میری عمر ۲۵ سال تھی۔ کسی ساتھی نے پست ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ الحمد للہ شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ ہر تاریک رات، روشن صبح کا پیغام لاتی رہی۔

دو اہم واقعات: میری ۲ عیدیں جیل میں گزریں۔ دوسری عید کی صبح ٹھیک فجر کی نماز کے بعد ایک ٹیلیگرام ملا کہ میرے صاحبزادے کا چاندرات کو انتقال ہو گیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ موت کی اطلاع پا کر میری قلبی کیفیت کیا ہوئی اس کو الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ ہر سال عید کے موقع پر وہ زخم تازہ ہو جاتا ہے۔ بڑی تسلی ہوتی ہے نبیؐ کے فرمان پر کہ جب کوئی بچہ انتقال کر جائے اور والدین اس پر صبر کریں تو وہ بچہ اپنے والدین کے لیے اللہ کے حضور سفارش کرے گا۔

موت کی خبر پھیلتے ہی سبھی ہندو مسلم بھائی تعزیت کے لیے میرے وارڈ میں آنے لگے۔ ان کے تعزیتی کلمات سن کر میں ان کو صبر اور خدائے وحدہ لاشریک پر توکل کی تلقین کرتا۔ عید کی نماز کا اعلان ہوا۔ مجھے ہی خطبہ دینا اور نماز پڑھانی تھی۔ خطبہ سننے کے لیے سارے غیر مسلم بھائی کنارے کنارے کھڑے ہو گئے۔ نماز بعد سبھی ساتھی نم آنکھوں اور آنسوؤں سے ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ مسٹر پوتول چندر ویدی بے ساختہ بول اٹھے اور بھرائی آواز میں کہا: ''میں نے صبر سنا تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے صبر دیکھ لیا۔ ہمارے اندر ایک نیا عزم و حوصلہ پیدا ہوا ہے۔'' الحمد للہ مسلمان عام طور پر صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں شاید اس بھائی کی نظر میں وہ پہلا واقعہ ہو۔

میں نے چاہا کہ پیرول پر رہائی مل جائے۔ کئی درخواستیں دیں لیکن پیرول نہیں ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لوگ معافی مانگ کر باہر نکل رہے تھے۔ بڑے چھوٹے سب لیڈروں کا یہی حال تھا۔ صرف جماعت اسلامی کے لوگ معافی مانگنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک روز ایک ذمہ دار شخص نے کہا موقع اچھا ہے، آپ بھی نکل سکتے ہیں۔ میں اس اشارہ کی زبان سمجھ گیا اور ڈی ایم کو لکھا کہ میں جماعت اسلامی کا رکن ہوں، وہ اللہ کے پیغام کو اللہ

کے بندوں تک پہنچا رہی ہے، استعفیٰ کا کوئی سوال نہیں۔ اگر میرے دس بچے ہوتے اور سب انتقال کر جاتے تو بھی استعفیٰ کی بات نہیں سوچی جا سکتی تھی۔

اللہ کی مہربانی، اس کے بعد درخواست بھیجنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ایک ماہ گزرا تھا کہ جیل کا میرا ایک ہندو ساتھی واپس آیا جو پیرول پر گیا ہوا تھا۔ میں نے کہا بھائی اپنی درخواست مجھے دکھا دو، میں پھر لکھوں شاید پیرول پر رہائی ہو جائے۔ انھوں نے دے دیا۔ میں نے پوری درخواست پڑھی، ایک جگہ جملہ لکھا تھا ''ماتا جی کے بچے کا دیہانت ہو گیا ہے۔ ماتا جی بہت پریشان ہیں۔ مجھے پیرول پر رہا کیا جائے'' وہ بھائی گیا اور واپس آ گیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے سوچا بھائی کا انتقال ہوا ہوتا تو درخواست میں بھائی لکھا جاتا۔ ماتا جی کے بچے سے مراد بچھڑا تو نہیں! اسی کو بنیاد بنا کر میں نے ڈی ایم کے خلاف حکومت کو ایک درخواست دی کہ ڈی ایم نے گائے کے بچہ کی موت پر پیرول دیا ہے، میرے بچے کے انتقال پر نہیں، انکوائری کرائی جائے ورنہ میں اپنا کیس عدالت میں لے جاؤں گا۔ یہ درخواست صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، وزیر داخلہ، وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش و اتر پردیش اور چند ممبران پارلیمنٹ کے نام تھی۔ بات صحیح وہی تھی جو میں نے سوچا تھا۔ بعد میں ڈی ایم نے مصالحت کی کافی کوشش کی لیکن میں نے اس کے اس غیر انسانی رویہ کی وجہ سے انکار کر دیا اور کہا کہ جو گفتگو ہونی ہے میسا بندیوں کے سامنے ہونی چاہیے۔ بہر حال ڈی ایم مشرا کو اس پوسٹ سے ہٹنا پڑا، سکریٹریٹ بھیج دیے گئے۔ دوسرے ڈی ایم صاحب آئے اور میری دوسری درخواست کے بغیر پیرول پر رہائی دے دی۔ 15 دن کے لیے میں باہر گیا۔

دوسرا اہم واقعہ: بعد میں رہائی کا آرڈر تو ہو گیا لیکن ضمانت دار کہاں سے لاتا؟ وطن سے کافی دور تھا۔ پچاس ہزار کی ضمانت درکار تھی۔ جناب عبدالاحد خاں صاحب نے کہا کہ والد صاحب کو سیونی سے بلا لیتا ہوں وہ ضمانت لے لیں گے۔ میں نے کہا اتنی دور سے ضمانت دار لانا مناسب نہیں، کچھ اور کوشش کرتا ہوں۔ چھندواڑہ کے کئی رفقا سے بات کی۔ اچانک بغیر میری کوشش کے ایک غیر مسلم قیدی میرے پاس آئے اور کہا میں آپ کی ضمانت

لوں گا۔ دیکھئے میں ایک معمولی انسان ہوں لیکن ایک بہت بہتر انسان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے جناب عبدالاحد خاں صاحب سے ذکر کیا۔ کسی طرح یہ خبر پھیل گئی۔ اس شخص پر دباؤ بڑھنے لگا کہ ضمانت نہ لے۔ وجہ یہ تھی کہ جیل سے نکلنے کے بعد مجرم کہیں فرار نہ ہوجائے۔ اس بھائی نے اس وقت سب کی بات مان لی اور آکر مجھ سے ساری تفصیل بتائی۔ میں نے کہا آپ کے جن بھائیوں نے مشورہ دیا ہے وہ سچ بھی ہوسکتا ہے۔ اس بھائی نے یہ جملہ سن کر کہا۔ میرا یقین ہے آپ لوگ فرار نہیں ہوسکتے اور اگر ہوں تو بھی میں ضمانت لینے کے لیے تیار ہوں۔ بس خاموشی سے جیلر کے دفتر آجایئے۔ چناں چہ میں دفتر گیا، دستخط کیا، تھوڑی دیر بعد جیل کے باہر تھا۔ افسوس کہ اس بھائی کا نام اور پتہ گم ہوگیا۔ اس گم نام بھائی کے لیے یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس احسان کا اسے اچھا بدلہ دے۔ ہدایت سے بڑھ کر اچھا بدلہ اور کون سا ہوسکتا ہے۔

کتنا بھلا انسان تھا وہ! تقریباً ۱۸ ماہ بعد آزاد ماحول میں سانس لینے کا موقع ملا تھا، لیکن باہر کی فضا بھی اچھی نہ تھی۔ ہر طرف خوف کا عالم طاری تھا۔ لوگ کھل کر گفتگو کرنے سے کتراتے تھے۔ ہر شخص گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ پولیس راج تھا۔ ظالم سمجھ رہا تھا کہ بازی ہم نے جیت لی ہے۔ فسادیوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ جی ہاں! مولانا محمد یوسف جیسا شریف النفس، ایک بڑی اسلامی تحریک کا قائد، ہتھکڑی پہنے جیل جارہا تھا۔ خدا کے ہزاروں بندے جو اس ملک کو سنوارنے کا کام کر رہے تھے، مظلوموں کی مدد کیا کرتے تھے، سیلاب، فساد، طوفان اور قحط کے مواقع پر بغیر کسی تفریق کے محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے انسانوں کی خدمت کیا کرتے تھے، ایسے لوگوں کو ظالم نے اندر کیا تھا۔ لیکن ظالم کو پتہ نہیں تھا کہ اس کے مکر و فریب کو ناکام بنانے والی بھی کوئی ہستی ہے جو اندھیرے کو دور کرسکتی ہے، مظلوموں کو انصاف دلاسکتی ہے، ظلم کا خاتمہ کرسکتی ہے۔ جب رات کی سیاہی بڑھتی ہے، روشن صبح قریب آنے لگتی ہے۔ بڑا ہی خوفناک تھا ایمرجنسی کا دور! اندر کے لوگ تو تکلیف کے باوجود مسکرا بھی لیتے تھے، لیکن باہر کے لوگوں کے چہروں کی مسکراہٹ غائب تھی۔ لوگوں سے ملاقات کے وقت اندازہ ہوتا تھا، ملاقات جتنی مختصر ہو اتنی ہی بہتر ہے۔ اللہ کسی ظالم

کوعوام پر مسلط نہ کرے، لیکن یہ جن پر مسلط ہوتے ہیں تو اکثر خود انھیں کے کرتوتوں کی بنا پر۔ کسی ملک پر ظالم کا تسلط عذاب کی ایک شکل بھی ہوتی ہے۔ اللہ ہر ملک اور ہر انسان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

میں جب وطن منڈیا ہوں پہنچا تو پہلا منظر یہ سامنے تھا کہ والد صاحب بستر علالت پر پڑے ہیں۔ بہت ہی کمزور ہو گئے ہیں لیکن عزم میں بلندی ہے۔ مایوسی نام کی نہیں۔ اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ معافی مانگ کر نہ نکلنا۔ سب سے چھوٹے بھائی کی تعلیم ختم ہو چکی ہے۔ میری ماں صبر وشکر کی پیکر، پردہ کی پابند خاتون، مگر حالات نے اتنا مجبور کر دیا کہ نقاب اتار کر لیکن پردہ کا پورا لحاظ کرتے ہوئے سر ڈھک کر سر پر ٹوکرے لیے ہوئے سوئی دھاگہ اور عورتوں کی آرائش کا سامان لیے گھر گھر دیہات دیہات فروخت کر رہی ہیں۔ محنت مشقت کے لیے تیار لیکن ہاتھ پھیلانے کی قائل نہیں۔ کبھی یہ کام نہیں کیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو، بوجھل قدم در در بھٹک رہی ہیں۔ اس لیے کہ ان کے دو بیٹے میسا میں بند، شوہر بیمار، ایک بیٹی اور ایک بیٹا چار افراد کا خرچ، بھوپال اور مرزا پور کے رفقا کا تعاون لیکن ضروریات زندگی کی تکمیل کا امکان کہاں، ایسی حالت میں ماں کو نکلنا پڑا۔ یہ دردناک اور ہمت شکن منظر قدم پیچھے ہٹانے کے لیے کافی تھا لیکن بس ایک سہارا تھا، خدا کا سہارا! بہترین سہارا وہی ہے! اللہ مرحوم والدین کی خدمات قبول فرمائے، مغفرت فرمائے، اور جنت الفردوس میں اعلیٰ جگہ عنایت فرمائے۔

دوسرا منظر: میں بچہ کے انتقال پر آیا تھا۔ ایمرجنسی میں اہلیہ نے جو تکلیف اٹھائی تھی وہ بہت دردانگیز تھی۔ ان کا غم ہلکا ہو سکتا تھا لیکن میرے آنے سے ان کے کرب میں اور اضافہ ہو گیا، غم کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔ ہوا یہ کہ ایمرجنسی کے خوفناک حالات نے اور CID کے رول نے میرے اور میرے سسرالی خاندان کے لوگوں میں بہت ہی فاصلہ پیدا کر دیا۔ ایک ہی قصبہ میں رہنے والے دو خاندان بہت ہی دور ہو گئے تھے۔ CID کے ایک رول کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک روز سی آئی ڈی محکمہ کا ایک شخص سسرال گیا اور میرے بارے میں پوچھا۔ چند لوگوں نے اشارہ کر کے بتا دیا کہ CID ہے، انکار

کر دیجئے۔ میرے خسر نے لاعلمی ظاہر کی، پھر میرے گھر پہنچا اور پوچھا سسرال کہاں ہے؟ ظہیر عالم کے بچے کہاں ہیں؟ والد صاحب نے پوری تفصیل بتائی۔ اس پر اس نے کہا کہ میں وہاں گیا تھا، انھوں نے تو بتایا کہ یہ میرے رشتہ دار ہی نہیں ہیں! والد صاحب مرحوم اس پر سخت ناراض ہوئے۔ تکلیف اور مصیبت کے وقت جس نے انکار کر دیا وہ رشتہ دار کہاں؟ یہ تلخی بہت بڑھی لیکن اس کو سن کر میں اہلیہ کو تسلی دینے بھی نہ جا سکا۔ اس رویے نے اہلیہ کو ذہنی طور پر بہت ہی متاثر کیا۔ طلاق کا مطالبہ ہونے لگا۔ ۱۰ روز اسی ذہنی کش مکش میں گزرے۔ کسی نوجوان کی ہمت پست کرنے کے لیے یہ سانحہ کافی تھا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے مدد فرمائی۔ اسی ٹینشن کے ساتھ میں چھندواڑہ جیل واپس آ گیا۔ مولانا محمد یوسفؒ امیر جماعت کو خط لکھا۔ مولانا نے جواب دیا، ابھی خاموش رہو۔ انشاء اللہ جلد ہی حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ ۳۔۴ ماہ بعد ایمرجنسی کا خاتمہ ہو گیا۔ آمریت کا تختہ پلٹ گیا، ظلم کا دور تمام ہوا۔ جماعت پر سے پابندی اٹھی، ملک نے پھر آزادی کا سانس لیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل سے بزرگ رہنما کی بات صادق آئی۔ 4 - 7 - 75 میں گرفتاری ہوئی 21-3-77 کو رہائی عمل میں آئی۔

بنیادی حقوق غصب ہوئے

□ محمد محسن
جبل پور (ایم۔پی)

ریڈیو کے ذریعہ یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی تھی کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اپنے مقدمہ کی شکست پر ایمرجنسی نافذ کر دی ہے، یہ ۲۶/جون ۱۹۷۵ء کی شب تاریک تھی جو ہندوستان کے لیے ایک مستقل شب سیاہ کے روپ میں یاد کی جاتی ہے۔ دوسرے دن کے اخبار جگہ جگہ سیاہی کے بدنما داغوں سے یہ اعلان کر رہے تھے کہ آزاد ہندوستان کے باشندوں کے بنیادی حقوق معطل کر دیے گئے ہیں۔ خبروں کے سننے کے بعد ذہنی تیاری ہوگئی تھی کہ اب داروغین اور قید زنداں کا حکم آنے ہی والا ہے۔

جماعت اسلامی کی رکنیت قبول کرتے وقت ہی یہ بات ذہن نشین کرادی گئی تھی اور از خود بھی ہوگئی تھی کہ راہ حق میں قید و بند، اور کوئی بھی آزمائش غیر متوقع نہیں ہوتی۔

۴/جولائی ۱۹۷۵ کو نماز جمعہ کی تیاری میں مصروف تھا کہ پولیس والے ٹی آئی وین میں آتے دکھائی دئے اور پھر مکان کا محاصرہ کر کے مختلف کمروں میں جا جا کر کونہ کونہ تلاش کیا۔ پھر تھانہ لے جا کر وہاں سے رات کے بارہ بجے ایک وین میں بٹھا کر مجھے سینٹرل جیل جبل پور پہنچا دیا گیا۔ اس وقت جبل پور میں سات ارکان تھے۔ یکے بعد دیگرے سب وہاں پہنچا دئے گئے۔ جس بیرک میں جگہ دی گئی اس رات ۲۰۰/افراد اس میں بند کیے گئے، جو نہایت گندہ تھا۔ ہم نے کسی طرح نماز مغرب اور عشاء ادا کر کے رات گزاری۔ پتوں میں کھانا کھایا گیا۔ شور شرابہ تو غیر متوقع نہ تھا، مگر کبھی کبھی گالی گلوج اور مار پیٹ بھی ہو جاتی تھی۔

جیلوں میں مجرموں کی اصلاح تو کیا ہوتی وہ اور بڑے مجرم بن کر باہر آتے ہیں۔ ہر تین مہینے میں میسا کی مدت میں توسیع کے کاغذات ملا کرتے تھے۔ ذہنی اذیت کی کیفیت ہمیشہ بنی رہتی۔ اس بات کے لیے بھی آمادہ کیا جاتا تھا کہ ہم معافی نامہ لکھ کر بھیج دیں، لیکن ہمیں اپنے خدا پر یہ بھروسہ تھا کہ حق ایک دن ظاہر ہوگا۔ دوسری مختلف تنظیموں کے افراد بھی ساتھ تھے۔ گاہے بگاہے بیرکیں تبدیل بھی ہوا کرتی تھیں۔ ہم نے کوشش کی کہ غیر مسلم بھائیوں تک دعوتِ حق پہنچائی جائے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ عظیم تفسیر تفہیم القرآن کی ترتیب کا آغاز بھی جیل میں ہوا تھا، اس کا مطالعہ کرنے کا موقع خوب ملا۔ قرآن کو مسلسل پڑھنے اور یاد کرنے کا فیض تو آج تک پہنچ رہا ہے۔ یہاں زندگی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قرآن سے شغف پیدا ہوا اور تعلق گہرا ہوا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے (ھدا للمتقین) یہ کتاب ہدایت ہے۔ بیرونی دنیا کی خبریں بھی ملتی رہتی تھیں۔ شہر کے بارے میں تو یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ ہر دل خائف، ہر نظر جھکی ہوئی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ۹۰ سالہ بزرگ شخصیت جناب حاجی کشف الدجیٰ صاحب بھی چھندواڑہ جیل سے جبل پور میں منتقل کیے گئے۔

ان کی آمد پر ہر شخص انگشت بدنداں تھا کہ جو آدمی اپنی ذاتی ضروریات کے لیے بھی چلنے پھرنے کے قابل نہ رہ گیا ہو اس سے بھلا دیش کو کیا خطرہ تھا۔ ۲۱ ماہ کی جیل کاٹنے کے نتیجے میں ہمارے قریبی رفیق فیروز صاحب، ریاض احمد صاحب، محمد عمر صاحب اور عطاء اللہ صاحب کاروباری لحاظ سے اتنے مجروح ہو گئے تھے کہ بعض احباب ۲۵ سال گزرنے کے بعد بھی سنبھل نہ سکے۔ ایک سال تک تو پیرول پر جانے کا بھی موقع نہیں دیا گیا۔ قانون کی ایسی سختی تھی کہ پیرول کا وقت ختم ہوتے ہی جیل کی طرف از خود روانہ ہونا پڑتا تھا۔ ابتدا میں کچھ ماہ تک کھانے پینے اور رہنے سہنے کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ فطری تقاضا ابھرا اور ہم نے جیل کی دیواروں اور سلاخوں سے سمجھوتا کر لیا گیا۔

ہم سات افراد بھائی جان کے نام سے جیل میں جانے جاتے تھے جو مختلف پہلوؤں سے نمایاں تھے۔ باقاعدہ خطاب بھی ہوتا تھا۔ تفہیم القرآن اور کچھ تحریکی لٹریچر منگوالیا گیا تھا۔ الحمد للہ یہ پہلو تو قابل شکر رہا کہ دین کی طرف رغبت اور دینی ماحول قائم رہا، اللہ کی

ذات پر یقین بڑھتا گیا، جیل میں رفتہ رفتہ علاج و معالجہ اور لباس وغیرہ کی سہولتیں حاصل ہو گئیں، مگر گھر پر میری والدہ اس قدر رویا کرتی تھیں کہ غیر معمولی طور پر بہت بوڑھی ہو گئیں۔

جس روز اندرا گاندھی الیکشن ہار گئیں تو حالات بدلے گویا وہ تمام اندرونی خطرات ختم ہو گئے تھے جنہیں بنیاد بنا کر ایمرجنسی نافذ کی گئی تھی۔ نصف رات گزرنے کے بعد بحیثیت وزیر اعظم ریڈیو سے یہ اعلان کیا گیا کہ ایمرجنسی ختم کی جاتی ہے۔ یہ کیسا ظلم تھا، یہ کیسی بربریت تھی کہ ایک شخص کی وجہ سے پورا ملک جیل خانہ بن گیا، زبانوں پر تالے لگ گئے اور قلم توڑ دیے گئے، لوگوں کے کاروبار تہس نہس ہو گئے، زندگی اجیرن ہو گئی۔ بس چاپلوس قسم کے لوگوں کا بول بالا رہا۔ اللہ کے فضل و کرم سے آج اہل ملک آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں اور وہ سیاہ راتیں اور دلخراش ایام ماضی کی یاد بن کر رہ گئے ہیں۔

آہنی سلاخوں کے پیچھے

❑ عبدالمجید
سوائی مادھوپور (راجستھان)

راقم الحروف ۵/جولائی ۱۹۷۵ سے ۷/جولائی کی دوپہر تک پولیس حراست میں آہنی سلاخوں کے پیچھے تقریباً 8x8 فٹ کی ایک تنگ و تاریک گندی اور بدبو دار کوٹھری (حوالات) میں بند رہا۔ ۷/جولائی کو ۵ بجے شام مجھے ڈسٹرکٹ جیل ٹونک پہنچایا گیا۔ ۱۱/مارچ ۱۹۷۷ء تک مع امیر مقامی مادھوپور جناب نذیر احمد صاحب اور امیر مقامی قصبہ سوروال جناب عبدالرشید صاحب کو ۲۱ ماہ ۱۵ یوم نظر بند رکھا گیا۔ ۱۱/مارچ کو شب میں رہائی ہوئی۔

راقم پر جماعت اسلامی ہند کے ناظم ڈویژن کی ذمہ داری تھی۔ ایمرجنسی کی برہنہ تلوار کا پہلا وار ضلع کے صدر مقام شہر سوائی مادھوپور میں 'سہ روزہ دعوت' کی ایجنسی پر ہوا۔ ۲۹/جون ۱۹۷۵ء کی صبح پولیس نے ۲۸/جون کا شمارہ ضبط کرلیا اور ایجنٹ کو پولیس تھانہ لے جا کر بیٹھا دیا اور پابند کیا کہ آئندہ اخبار تقسیم نہ کروگے۔ اخبارات کے خلاف اس ناجائز کارروائی پر ایک قانونی مشیر کے توسط سے ضلع پولیس کے ایس پی سے ملا گیا اور بمشکل تمام اس شرط پر تقسیم کی اجازت دی کہ اخبار کی ایک کاپی ایس پی آفس میں دی جائے گی۔ اس مرحلے سے گزر کر راقم اپنے طے شدہ پروگرام پر وزیرپور روانہ ہوگیا۔

واپسی میں ۵/جولائی کو جب ریلوے اسٹیشن سوائی مادھوپور پر ٹرین سے اترا تو سی آئی ڈی کے چار پانچ افراد نے پلیٹ فارم سے باہر گرفتار کرلیا اور ٹاؤن چوکی پولیس کی حوالات

میں بند کر دیا۔

سی آئی ڈی انسپکٹر نے میرا بیگ جس میں کپڑے اور دیگر ضروری اشیائے معمولات اور چالیس روپے کچھ پیسے تھے اپنی تحویل میں لے لیا۔ میں نے اس سے لنگی اور ایک تولیہ مانگ لیا چناں چہ حوالات کی گندی کھوٹھڑی کا ایک کونا تولیہ سے صاف کیا، لنگی بچھائی اور نماز مغرب ادا کی۔ پیاس کی شدت سے حلق بھی خشک ہو رہا تھا، سنتری سے پانی مانگا تو اس نے سامنے لگے ہوئے کیلے کے درخت سے پتا توڑا اور ایک حصہ آہنی سلاخوں سے اندر کر کے باہر سے دھوپ میں تپا ہوا پانی ڈالا۔ پیاس بجھنے کا تو سوال ہی کیا تھا حلق ضرور تھوڑی دیر کے لیے تر ہو گیا۔ حوالات کے اندر نہ تو پانی کا انتظام کیا گیا اور نہ کھانے کا۔ پولیس کے اس بے رحمانہ طرز عمل کے مقابلے میں ربّ رحیم قادر مطلق وحدہ لاشریک نے اپنی رحمت خاص سے سکون قلب عطا فرمایا کہ تعلق باللہ کی ایک عجیب کیفیت ولذت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ خدا کی تائید ونصرت کا ایک عجیب کرشمہ یہ دیکھا کہ جس گرمی اور حوالات کے حبس اور تاریکی وتنگی سے فطری طور پر ایک گھبراہٹ ہو رہی تھی وہ نہایت پرسکون جگہ بن گئی، نمازیں بھی ادا ہوئیں، نیند بھی حسب ضرورت اطمینان کے ساتھ آتی رہی۔ ذکر اللہ اور تعلق باللہ کی لذت و حلاوت میسر آئی۔ دوسرا غیبی مدد کا ایک یہ مشاہدہ ہوا کہ ایک صاحب جو میرے شناسا تھے پندرہ، سولہ سال بعد مجھے ایک عجیب حالت میں دیکھتے ہیں اور پھر نیچی نگاہ کر کے پولیس اسٹاف کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ میری نظر بھی ان پر سرسری طور پر پڑی مگر پہچان نہ سکا۔ جب رات اندھیرا اور بالخصوص اس جنگلے میں گہرا اندھیرا ہو گیا تھا، آواز دیتے ہیں۔ مولانا صاحب کھانا لاؤں؟ میں نے معذرت کے ساتھ انکار کر دیا اور پھر تعارف چاہا تو مدت کے بچھڑے ہوئے شناسا عبدالرزاق کو پہچانا، اس کے ذریعہ شہر کے رفقا کو گرفتاری کی اطلاع پہنچائی۔ میں نہایت اطمینان کے ساتھ سو گیا، نیند آ گئی، مگر دوبارہ آواز آئی کھانا لایا ہوں۔ سنتری نے جو غالباً ان کی جان پہچان کا تھا آہنی گیٹ کھولا، ایک ٹفن اور ایک تھرمس اور پانی وغیرہ میرے حوالہ کر دیا۔ ٹفن وزنی تھا میں نے کھولا، پراٹھوں اور سبزی سے بھرا ہوا تھا اور دو اچھی خوراک والوں سے بھی ختم ہونے والا نہیں تھا۔ میں نے اپنے

لایق رکھ کر باقی کھانا واپس کرنے کی بہت ضد کی مگر وہ یہ کہہ کر چھوڑ گئے کہ صبح کام آجائے گا۔

اندھیری کوٹھڑی اور تنہائی میں خدا کی شان وقدرت کے مشاہدہ نے جہاں صبر وشکر کے بے پایاں انعام سے نوازا، یہ شب تنہائی جب گزر چکی تو فجر کی نماز کے بعد سنتری نے گیٹ کھولا، دو پولیس مین ہتھکڑی لگا کر بیت الخلا کے لیے قریب کے ایک کھیت میں بٹھا کر ذرا فاصلہ پر پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ آب دست کے لیے ایک گڈھے میں جس میں برسات کا پانی جمع تھا لے گئے اور واپس آکر ہتھکڑی کھولی اور پھر جنگلے میں بند کر دیا۔ ۶/ جولائی کی دوپہر کو پولیس امیر مقامی سوائی مادھوپور اور امیر مقامی قصبہ سوروال کو گرفتار کر کے لے آئی۔ اب اس جنگلے میں ہم تین رفیق تھے۔ ۷/ جولائی کو ہمیں نماز فجر کے بعد چار سپاہیوں نے مضبوط ہتھکڑیاں پہنائیں اور بیت الخلاء کے لیے اُس کھیت میں لے جایا گیا جہاں اس سے پہلے مجھے لے جایا گیا تھا۔ ہتھکڑی پکڑے ہوئے چاروں سپاہی سامنے کھڑے ہو گئے۔ پولیس والوں کا یہ طرز عمل ہماری روحانی اذیت کا ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ بہر کیف یہ ایک اضطراری حالت تھی جسے صبر کے ساتھ برداشت کیا۔

۷/ جولائی دس بجے دن کو توال شہر سوائی مادھوپور نے کلکٹر کا ایک حکم دیا کہ تمہیں میسا ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے ڈسٹرکٹ جیل ٹونک بھیجا جارہا ہے۔ چار پولیس مین ہتھکڑی لگائے ہوئے بس اسٹینڈ لے گئے اور ایک ایسی بس میں لے جا کر کھڑا کر دیا جو پہلے ہی حد سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ بہر کیف ۳ گھنٹے کی مسافت طے کر کے بس اسٹینڈ ٹونک پر اُترے۔ تقریباً تین کلومیٹر بس اسٹینڈ سے جیل تک پیدل لے جایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں کے ہاتھوں جیل تک بعافیت تمام پہنچایا، جیلر نے ہمیں اپنی تحویل میں لے کر ایک بیرک میں منتقل کر دیا۔

دوران سفر معلوم ہوا کہ پولیس ایس۔ ڈی۔ ایم گنگا پور کو اپنے ہمراہ لے کر میری گرفتاری کے لیے وزیر پور پہنچی، مجھے وہاں نہ پا کر تین ارکان جماعت کو جن میں میرا ایک لڑکا بھی تھا گرفتار کر کے گنگا پور سیشن جیل بھیج دیا اور میری رہائش کا ایک کمرہ جو جامع مسجد

سے کرایہ پر تھا اور جس میں جماعت کا کچھ ریکارڈ، لٹریچر، کپڑے، بستر وغیرہ سامان تھا پولیس نے ضبط کر کے گنگا پور تھانے میں پہنچا دیا اور کمرہ سیل کر دیا گیا۔

نوائی اور ٹونک سے پہلے ہی ۶ / جولائی ۱۹۷۵ء کو چار رفقاے جماعت گرفتار کر کے جیل پہنچا دئے گئے تھے، جنہیں D.I.R کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں برادرم عبدالرحیم صاحب رکن جماعت، ناظم ضلع تھے باقی تین متفق رفیق تھے۔

عام قیدیوں کے ساتھ کھانا دیا جاتا، صبح و شام بیرک سے کچھ گھنٹوں کے لیے باہر نکالا جاتا۔ ہمیں جس وقت باہر نکالا جاتا تو دوسرے قیدیوں کو بیرک میں بند کر دیا جاتا، انہیں ہم سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم اپنے گھر والوں سے خط و کتابت نہیں کر سکتے تھے۔ کسی رشتہ دار یا دوست احباب کو ملاقات کی اجازت نہیں دی جاتی۔ گرفتاری کا پہلا عشرہ سخت پابندی کا گزرا۔ جب R.S.S. اور دیگر پارٹیوں کے ذمہ دار اور ورکرس روز آنا شروع ہوئے اور انہیں بھی 'C' کلاس میں رکھا گیا تو انھوں نے احتجاج شروع کر دیا اور ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تو حکومت کے ذمہ داران (کلکٹر اور ایس پی وغیرہ) آئے اور تمام سیاسی نظر بندوں کو 'B' کلاس دئے جانے کا حکم جاری کیا اور وہ سہولتیں فراہم کیں جن کا نظر بندوں نے مطالبہ کیا۔ اب ان نظر بندوں کی تعداد ساٹھ ہو گئی تھی۔ ان سب کو ایک کھلے ہال میں منتقل کر دیا گیا۔ اب سب آزادانہ گھومنے پھرنے لگے۔ ہم نے قرآن و احادیث کے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ آر۔ ایس۔ ایس کے ورکروں نے اپنی شاکھائیں شروع کیں اور پھر ایک مشترکہ مشورہ سے پروگرام بنا کہ بعد نماز عصر تا مغرب ہر ایک پارٹی کا نمائندہ اپنا تعارف، پارٹی کا مقصد اور نصب العین اور گرفتاری کا واقعہ بیان کرے، چناں چہ یہ پروگرام بہت دن تک چلتا رہا۔ ہمیں کافی موقع ملا کہ اپنا اور جماعت کا تعارف کرائیں اور اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں دور کی جائیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ اپنی بساط و استعداد کے مطابق یہ کام انجام دیتے رہے۔ سارے نظر بندوں کا ایک ہی جگہ رہنا، اُٹھنا بیٹھنا، باہمی رابطہ بڑھانے میں معاون بنا۔ سب لوگ احترام و محبت سے ساتھ رہے۔ سب کا میس (مطبخ) مشترکہ تھا۔ کھانے کے اوقات متعین تھے، سب ایک ہی صف میں بیٹھ کر کھانا

کھاتے۔ دوسری پارٹیوں کے نظر بندوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ہم صرف پانچ لوگ جماعت اسلامی سے وابستہ تھے اس کے باوجود ہم سے سب اس قدر متاثر تھے کہ ہر کام میں ہمارا مشورہ ضروری سمجھتے تھے۔ حکومت نے نظر بندوں کے راشن کی خصوصی فہرست جاری کی جس میں انڈے، گوشت اور مچھلی بھی شامل تھی۔ چناں چہ ہم نے انڈے منگوانا شروع کر دئے، اُبال کر استعمال کر رہے تھے۔ اس پر دو ایک روز بعد ہی آر۔ ایس۔ ایس کے ایک ذمہ دار نے اپنی پارٹی کی ایک نشست میں اعتراض اٹھایا لیکن پارٹی کے دیگر لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ جب یہ معلوم ہوا تو ہم ایک دوسری خالی بیرک میں اپنے پلنگ و بستر لے کر منتقل ہو گئے۔ سوائے مذکورہ معترض کے تمام لوگوں کو اس کا صدمہ ہوا اور چند گھنٹے بعد ہی یہ ہمارا تمام سامان اصل ہال میں واپس لے آئے۔ انھوں نے کہا کہ کسی ایک شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ کی خوراک وغیرہ پر پابندی لگائے، آپ سے متعلق تمام ضروری اشیاء کی فراہمی کی ذمہ داری ہماری ہے۔ اب بلا تکلف گوشت اور مچھلی بھی آنے لگی۔

ان لوگوں سے ہمارے ذاتی روابط خوشگوار اور محبت بھرے رہے۔ بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک جن سنگھی ورکر پنڈت چوکھے لال بڑے پر مذاق تھے، بات بات میں زبان پر گالی رہتی تھی، آہستہ آہستہ ان کو اس بدکلامی سے روکنے کی کوشش کی تو عہد کر لیا کہ اب گالی نہیں نکالوں گا۔ اتفاق سے عادتاً گالی نکل جاتی تو اس روز کا کھانا پینا از خود بند کر دیتے تھے۔ اس طرح یہ عادت چھوٹ گئی۔

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقعوں پر عید ملن کے پروگرام ہوئے۔ ہماری طرف سے اس موقع پر عام قیدیوں کو دعوت طعام دی گئی جس میں کھانے کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ میسا ایکٹ کے تحت راشن کا کوٹہ مقرر تھا چناں چہ دودھ، گھی، شکر وغیرہ تمام نظر بندوں کا اتنا جمع ہو جاتا تھا کہ کسی خصوصی دعوت کا اہتمام کوئی مشکل نہ ہوتا۔ اخلاقی قیدیوں میں چند سنجیدہ بھی تھے، ان سے بھی دعوتی روابط رہے۔

پہلے روز ہم جیلر کے آفس میں داخل ہوئے تو بڑے بورڈ پر قیدیوں کی تعداد پر نظر پڑی، اندر ۱۹۶ اخلاقی قیدی اور پانچ سیاسی نظر بند لکھا ہوا تھا۔

ابتدءً سخت پابندی میں رکھ کر جیلر نے جب ہمارے کپڑے عام قیدیوں سے دھلوانا چاہا تو ہم نے اس سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ ہمیں ٹنکی پر جانے کی اجازت دی جائے ہم اپنے کپڑے خود دھوئیں گے۔ عام قیدیوں کو غلام نہ بنایا جائے۔ آخر تین چار ہفتہ بعد وہ تمام پابندیاں ختم ہو گئیں جو لگائی گئی تھیں۔

خدا کا شکر و احسان ہے کہ افراد خانہ کو بہت مطمئن اور صابر و شاکر پایا اور اس بات نے حوصلے کو مزید تقویت پہنچائی۔

الیکشن اور ظالم حکومت کی شکست کے بعد جب ہم تین ارکان جماعت ۱۱/مارچ ۱۹۷۷ء کو شب ساڑھے دس بجے ٹونک سے رہا ہوئے تو شہر سے دور جنگل میں واقع جیل سے ہم نے نکلنے سے انکار کر دیا کہ ناواقف شہر میں ہم اپنے رفیقوں کے مکان پر کیسے پہنچیں گے؟ جیلر برابر کہتا رہا کہ آپ لوگوں کی رہائی کے حکم کے بعد ایک گھنٹہ بھی جیل میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم برابر انکار کرتے رہے اور جیلر نہایت عاجزی کے ساتھ التجا کرتا رہا کہ یہ میرے لیے مشکل ہے، میری ملازمت کے لیے خطرہ ہے۔ بالآخر اس نے کہا آپ کی رہائی کے لیے اپنا آدمی ساتھ کرتا ہوں۔ ہم نے ان کی بات قبول کر لی اور پیدل چل کر اپنے ایک رفیق کے یہاں پہنچ گئے۔ ہماری رہائی کی خبر تو ٹونک شہر میں رات ہی کو ہو گئی تھی، صبح ٹونک کے وہ تمام افراد جو جیل میں ساتھ رہے تھے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ان سب میں زیادہ تر افراد آر۔ ایس۔ ایس کے تھے۔ انھوں نے ہمارے جلوس کا پروگرام بنایا۔ ہمارے منع کرنے پر بھی نہ مانے اور شام ۴ بجے جامع مسجد سے جلوس شروع ہو کر ۸ بجے شب گھنٹہ گھر پہنچا جہاں پبلک میٹنگ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ تقاریر ہوئیں، روداد جیل عوام کو سنائی، دو گھنٹہ کا پروگرام پورا ہونے پر جلسہ ختم ہوا۔

سوائی مادھو پور میں اسی شب ریڈیو سے ہماری رہائی کی خبر سنی گئی، وہاں کے رفقا ایک ٹرک بھر کر صبح ٹونک پہنچ گئے۔ مگر ٹونک کے کچھ بزرگوں نے جو جماعت سے محبت کرنے والے تھے دوپہر تک ٹونک سے روانہ نہیں ہونے دیا۔ ہمارے اعزاز میں دعوت طعام رکھی گئی جس میں شہر کے چند معززین کو بھی مدعو کیا گیا۔ دوپہر بعد ہم لوگ رفقائے مادھو پور کے

ہمراہ روانہ ہوئے۔ راستے میں جیل کے ایک ساتھی کی بستی تھی یہ آر۔ایس۔ایس کے نوجوان تھے اور ہم سے بہت مانوس تھے۔ ہماری خبر ملی تو سڑک پر ہمارے انتظار میں ایک مجمع ساتھ لے کر ۸ بجے شب کھڑے ملے، استقبال کیا، ناشتے کے بعد کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مجبور ہو کر ان کی دعوت بھی قبول کی۔ تقریباً ۲ گھنٹے کے پروگرام کے بعد مادھو پور روانہ ہوئے۔ صبح ۴ بجے نعرہ تکبیر کی گونجوں میں ہمارا قافلہ دفتر جماعت اسلامی پہنچا۔ قرب و جوار کے رفقا شب ہی میں ہمارے یہاں پہنچ چکے تھے۔ دن بھر کی ملاقاتوں کے بعد یہاں بھی آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے کارکنوں نے شب میں صدر بازار میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا۔ راقم کی تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوا۔ صبح ان ہی حضرات نے شہر میں ہمارا جلوس نکالا جو کلکٹریٹ ہوتا ہوا قصبہ سوروال پہنچا اور پھر گنگا پور، وزیر پور ریل کے ذریعہ اسی روز پہنچ گیا۔ مادھو پور سے ہمارے کئی جیل کے ساتھی جو جن سنگھ کے ذمہ دار تھے اور ہمارے کئی رفقا جن میں وکلا بھی تھے وزیر پور پہنچانے کے لیے ہمارے ہم سفر تھے۔ گنگا پور کے جیل کے ساتھی ایک وکیل صاحب جو آر۔ایس۔ایس سے وابستہ تھے انھوں نے جلوس اور جلسہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اسٹیشن سے جلوس شروع ہو کر سیشن جیل پر جلسے کی شکل اختیار کر گیا۔ اس طرح سفر کرتے ہوئے راقم ۱۶/ مارچ کو ظہر کے وقت اپنے گھر پہنچا۔

ہمارے آنسوؤں کو ، التجا کو
ترستا رہ گیا قاتل ہمارا

ایمرجنسی کی یادیں اور آپ بیتی

□ محمد علی

جودھپور (راجستھان)

قافلہ سخت جاں کی اس حقیر اکائی محمد علی قاسمی ابن محمد عالم، بوقتِ اسیری رکن جماعت اسلامی ہند کی گرفتاری ۴ جولائی کو میسا ایکٹ کے تحت ہوئی۔ مدت اسیری ۴ر جولائی تا اختتام ایمرجنسی (غالباً ۲۲ مارچ ۱۹۷۷ء) رہی۔

جودھ پور میں یوں تو جماعت کے احباب خاصے تھے مگر رکن کوئی نہ تھا بلکہ راجستھان کے یہ سارے مغربی اضلاع ارکانِ جماعت سے خالی تھے۔ مقامی رکن جماعت جناب حکیم مظفر حسین صاحب بھی بہت پہلے یہاں سے منتقل ہو گئے تھے۔ چارو ناچار قرعہ میرے ہی نام کا نکلا اور حکومت کے اہل کاروں کو خانہ پوری کے لیے بہت آسانی سے بلی کا بکرا دستیاب ہو گیا۔ حسبِ نظم جماعت میں نے حلقہ راجستھان کو (مرزا پور، یوپی سے) اپنے نو وارد ہونے کی اطلاع دے دی تھی، اُس وقت کے امیر حلقہ محترم مولانا مظہر الحق صاحب (مولانا موصوف خاص دیو بند کے رہنے والے تھے اور جماعت کے سابقون اولون بلکہ دار العلوم دیو بند اور مظاہر العلوم کے شروع کے ہنگامہ خیز زمانے میں جماعت کے معروف متاثرین شیوخ، اساتذہ اور طلباء میں سے ایک تھے اور حلقہ دار العلوم کے صاحبزادگان میں شمار کیے جاتے تھے) نے نظم جماعت کی ذمہ داری دی تھی اور بعد ازاں شہر کی تاریخی شاہی ایک مینار والی جامع مسجد میں باضابطہ ہفتہ وار اجتماع شروع ہو گیا تھا۔

غالباً یہ دوسرا یا تیسرا ہی اجتماع جاری تھا کہ درمیان میں معلوم ہوا کہ جماعت پر بھی پابندی لگ گئی ہے اور گرفتاریاں بھی شروع ہوگئی ہیں۔ مدرسہ کے دفتر میں قریب دس بجے صبح ایک صاحب آئے اور پوچھا کہ آپ میں مولانا محمد علی صاحب کون ہیں؟ اور جب میرا تعارف کرایا گیا تو وہ صاحب بڑے خیر خواہانہ انداز میں فرمانے لگے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، جتنی گرفتاریاں ہونی تھیں وہ ہوگئیں۔ اسی طرح کے دو چار جملے دہرا کر جلدی سے یہ صاحب (سی آئی ڈی) باہر گئے ہی تھے کہ چند ثانیہ بعد پولیس کا عملہ گاڑی سمیت گیٹ پر آدھمکا اور مجھ سے کہا گیا کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ساتھ آئیں کلکٹر صاحب نے بلایا ہے۔ مجھے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ یہ لوگ اصلاً مجھے کہاں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ حمائل شریف، قلم اور ایک ڈائری سنبھالے ہوئے گاڑی میں بیٹھا اور قریب کے پولیس تھانے میں ابتدائی چھان بین اور پوچھ تاچھ کے بعد قریب دن کے ایک بجے جیل بھیجا گیا۔

جودھ پور ایک معروف سینٹرل جیل ہے۔ بھنڈرا والا کے ساتھیوں اور پھر ادھر کئی سالوں سے تحریک کشمیر بشمول حریت کانفرنس کے قائدین اور خاص کر سید علی شاہ گیلانی نے اس کی میزبانی قبول کر کے عالمی پیمانے پر اسے شہرت عطا کر دی ہے۔ ملک میں نفاذ ایمرجنسی، ڈی، آئی آر اور میسا کے الفاظ اور اصطلاحات اور پھر اس کے جلو میں خوف و ہراس، ہنگامہ، دہشت خیزی اور غیر یقینی حالات، مجھ جیسے ناتجربہ کار ہی کے لیے نہیں بلکہ حکمران و افسران حتیٰ کہ مرکزی اور اعلیٰ لیڈران کے لیے بھی ایک مبہوت کن مسئلہ بن گیا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا ہوگا؟ کوئی وارنٹ یا کچھ کہے یا بتائے بغیر ہی مجھے یہاں پہنچا دیا گیا اور ایک پرانی نیکر، ہاف قمیص اور ایک بوسیدہ کمبل، ایک عدد المونیم کی تھالی اور تامچین کا مگہ تھما کر پھانسی یافتہ والے بیرک نمبر ۱۰ کے سیل میں بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آنند مارگی نوجوان کو بھی میرا رفیقِ زنداں بنا دیا گیا۔ جب کچھ طوفان تھما اور حالات قدرے معمول پر آنے لگے تو پندرہ دن بعد وارنٹ دیا گیا جس میں میسا کے تحت میری گرفتاری بتائی گئی تھی۔

اس درمیان جن سنگھ اور کمیونسٹ پارٹی وغیرہ کے قریب دو ڈھائی سو افراد یہاں میسا کے تحت آچکے تھے جنہیں B کلاس کی سہولتیں حاصل تھیں اور امتیازی پوزیشن میں رکھا گیا تھا۔ ایک دو ماہ بعد راجستھان کے علاوہ دہلی، پنجاب، ہریانہ اور مغربی یوپی سے بھی لوگ یہاں لائے گئے۔ اس طرح قریب تین سو کی تعداد یک جا ہوگئی تھی، جس میں مسلم نام سے میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی کہ مجھے جماعت کے دوسرے لوگوں کے ساتھ وہاں ٹرانسفر کر دیا جائے جہاں وہ اکٹھے رکھے گئے ہیں لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور اخیر وقت تک میں یہاں اکیلا ہی رہا۔ جیل کی پوری عمارت اور اندر کی بیرکیں گول دائرے کی شکل میں بنی ہوئی ہیں۔ ان بیرکوں کے بالکل وسط میں بہت بڑا میدان ہے اور اسی میدان میں عبادت گاہیں (مسجد اور چرچ کے علاوہ) بنی ہوئی ہیں اور اسی میں سرکاری اجتماع اور عیدین وغیرہ بھی منعقد ہوتے ہیں۔ تمام سیاسی قیدی لوگ روزانہ عصر بعد اسی میدان میں مندر کے پاس جمع ہو جاتے اور گپ شپ کے بعد شام کے وقت جیل کے حسب ضابطہ اپنے بیرکوں میں لوٹ جاتے۔ ایک روز میں بھی ان میں جا شامل ہوا۔ چوں کہ میں مسلم نام کا اکیلا ہی تھا اور اپنی وضع قطع، جسم و جان سے بھی بالکل الگ اور نمایاں دکھائی دیتا تھا اس لیے سب کے سب میری جانب سوالیہ اور کچھ ہونٹنگ کے انداز میں متوجہ ہوئے۔ پہلے نام پوچھا جواب میں میں نے کہا محمد علی۔ تو وہ سب چمک اٹھے اور طنزیہ طور پر کہنے لگے اچھا تو آپ جناح شاہب پھر آ گئے؟ میں نے کہا میں پنر جنم پر یقین نہیں رکھتا اس لیے میں جناح صاحب نہیں بلکہ صرف محمد علی ہوں۔ پھر پوچھا آپ کس جماعت سے تعلق کی بنا پر یہاں لائے گئے ہیں اور آپ کا اُدیشیہ (نصب العین) کیا ہے؟ جواباً میں نے کہا کہ مجھے جماعت اسلامی ہند کے رکن کی حیثیت سے لا گیا ہے۔ میں نے جماعت کے نصب العین کا تعارف کرایا۔

بتایا کہ ہماری جماعت کا نصب العین یہ ہے کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کو سوامی اور شاسک مان کر اپنی پوری زندگی اور زندگی کے ہر معاملہ کو اسی کے قانون کے حوالہ کر دیں، یعنی پوجا سے لیکر شادی بیاہ، حکومت و سیاست سب کچھ اسی کی ہدایت اور قانون کے تحت ہو۔ ہم تمام

انسانوں کو دعوت دیتے اور اپیل کرتے ہیں کہ آیئے ہم سب مل کر اسی آدرش اور ماڈل کا بھارت ورش بنائیں۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ سب ایک زبان ہو کر بولے او ہو! جنا تو آدھے ہندوستان کی بات کرتا تھا مگر تم تو گویا کل بھارت لینا چاہتے ہو! میں نے یہ کہہ کر اس موضوع کو ختم کر دیا کہ بھائی پہلی ہی ملاقات میں ایسے کڑوے اتیہاس کو چھیڑنا مناسب نہیں بلکہ اچھی بات یہ ہوگی کہ اس وقت ہم آپ اور ہمارا یہ پیارا ملک جس آزمائش کے شکار ہوئے ہیں اس میں پورا اترنے کے لیے سوچ وچار کریں۔

کچھ دنوں بعد ایک روز جن سنگھ اور کمیونسٹوں کے درمیان اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ اس بیرک میں انڈا نہیں آئے گا (سیاسی قیدیوں کے لیے اسپیشل ڈائٹ کا انتظام تھا، یہ انڈا اسی کا ایک حصہ تھا) آگے چل کر یہ دو الگ گروپ بن گئے (حالانکہ بعد میں سب بڑے بڑے پنڈے، برہمن اور جینی سب کچھ کھانے لگے) تو آر۔ایس۔ایس والوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کس گروپ میں رہو گے؟ میں نے کہا بھائی آپ لوگوں نے تو چیلنج کر دیا ہے کہ یہاں جو انڈا توڑے گا اس کے ہاتھ پیر توڑ ڈالے جائیں گے، تو ظاہر ہے میں انڈا استعمال تو کرتا ہوں مگر یہاں نہیں کروں گا' اس پر وہ بالکل سٹ پٹا گئے۔ آگے کسی دوسرے موقع پر کمیونسٹوں نے مجھ سے کہا کہ محمد علی یہ کیا معاملہ ہے کہ تم رہتے سہتے اور کھاتے پیتے تو ہمارے ساتھ ہو مگر جن سنگھ اور آر۔ایس۔ایس والوں کی حمایت کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے اخلاق و بیوہار اچھے ہیں اس لیے آپ کے ساتھ رہتا ہوں مگر نظریہ کے لحاظ سے آپ کے مقابلہ میں وہ بہتر ہیں کہ کم از کم وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اس سنسار کا کوئی مالک پوجیہ اور شاسک ضرور ہے' یہ الگ بات ہے کہ ان کے بے شمار دیوی دیوتا ہیں۔ اور جہاں تک جماعت اسلامی والوں کا تعلق ہے ہماری کوشش یہی ہے کہ یہود یواد چھوڑ کر صرف ایک ایشور کو عملاً تسلیم اور سوی کار کر لیں۔

چند روز کے بعد مجلس آگے چل کر رسمی مجلس، اجتماع (عام سبھا) میں تبدیل ہو گئی اور ہر روز نئے موضوعات پر سمپوزیم، خطاب یا اوپن ڈسکشن کا پروگرام ہونے لگا۔ اسی مجلس کے ذریعہ کمیونسٹوں نے جماعت اسلامی اور خاص کر مولانا مودودیؒ (کمیونسٹوں کے حلقہ میں

مولانا مودودیؒ اور تحریک اسلامی جانی پہچانی چیز ہے) سے متعلق بہت ساری معلومات حاصل کیں اور جن سنگھ گروپ نے تو اپنے وہ سارے پٹارے ایک ایک کر کے کھول دئے جسے انھوں نے بزعم خود اسلام اور مسلمانوں کو زیر اور مرعوب کرنے کے لیے اختیار کر رکھا ہے، مثلاً اسلام دھرم مردوں کو چار شادیوں کا حکم دیتا ہے' پردہ کے نام سے عورتوں کو قید خانے میں رکھا جاتا ہے، تین طلاق اور وہ بھی صرف مردوں کے لیے، دارالکفر' جزیہ، جہاد اور اسلام تلوار کی دھار پر منوایا جاتا ہے۔ اس طرح کے اور چند معروف موضوعات پر خطاب اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ مجلس ہمارے لیے کئی لحاظ سے بڑی مفید ثابت ہوئی۔ ان کی غلط فہمیاں دور ہوئیں، اسلام کے بارے میں تفصیلی معلومات اور مطالعہ کا شوق بھی پیدا ہوا۔ (واضح رہے کہ ان کی اکثریت وکلاء ٹیچر اور ڈاکٹر و پروفیسر کی تھی) خود ایک روز انھوں نے یہ کہا کہ محمد علی! یہ کیا بات ہے کہ تمہارا بھاشن تو ہم لوگوں کو خوب سمجھ میں آتا ہے اور تم کیا کہنا چاہتے ہو یہ بخوبی ہم لوگ سمجھ جاتے ہیں لیکن ہمارے محلوں کی مسجدوں اور چوپالوں پر ملاّ لوگ برسوں سے زور زور سے چلا کر نہ جانے کیا کہتے ہیں ہمارے کچھ بھی پلے نہیں پڑتا؟ میں نے قدرے تفصیل سے اُن بے مقصد قصے اور کہانیوں کے بارے میں بتایا کہ ان سے کیا کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔

آر۔ ایس۔ ایس کے ایک جینی وکیل جن کی چارپائی بالکل میرے بازو میں تھی مکتبہ الحسنات کا ہندی اور انگریزی ترجمہ عربی متن والا قرآن مجید بہت شوق سے پڑھنا شروع کیا جس میں اصل ترجمہ سے پہلے پیغمبر آخرالزماںؐ کی سیرت و سوانح کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا تھا۔ اسے پڑھ کر وکیل موصوف بہت متاثر ہوئے اور ایک روز مجھ سے بول اٹھے کہ میں محمدؐ صاحب کی جیونی سے بہت پربھاوت ہوا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ جہاں مہاویر سوامی اور دوسرے بہت سارے دھرم گروؤں کی تصویریں میں نے اپنے خاص روم میں سجا رکھی ہیں وہیں محمدؐ صاحب کی تصویر بھی آویزاں کروں۔ اس پر میں نے جواباً کہا کہ حضرت محمدؐ کی جیونی پڑھ کر آپ پر بھاوت ہوئے بڑی خوشی کی بات ہے اور آپ کے لیے شبھ اور بابرکت اوسر ہے' مگر آپ کی یہ آرزو کہ محمدؐ کی تصویر آویزاں کروں پوری نہیں ہوسکتی کیوں کہ

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم مسلمان کوئی تصویر (اسکیچ، اسٹیچو) بنانا اور رکھنا صحیح نہیں سمجھتے۔ وکیل موصوف نے میری جیل ڈائری میں اپنے قلم سے اپنے تاثرات کو بڑی تفصیل سے نوٹ فرمایا اور بعد میں بھی یہ تعلق قائم رہا۔

جیل کے ذمہ دار سکسینا صاحب ایک با اخلاق اور علم دوست شخص تھے، متعارف ہونے کے بعد خود ہی مجھ سے ایک روز کہنے لگے کہ محمد علی صاحب! آپ کی موجودگی میں میرا ایک بہت نازک اور مشکل مسئلہ حل ہو گیا ہے، میں نے پوچھا کہ وہ کیا؟ کہنے لگے نمازِ جمعہ اور عیدین کے لیے شہر سے قاضی اور مولوی منگوانے کا مسئلہ، لہٰذا آئندہ جب تک آپ یہاں رہیں گے یہ ذمہ داری آپ نبھائیں گے۔ ہم نے اس پیش کش کو من جانب اللہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ نماز جمعہ اور عیدین کے علاوہ نماز تراویح میں قرآن سنانا اور تراویح، درس قرآن اور ہفتہ وار اجتماع وغیرہ بھی شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں نے قرآن پاک ناظرہ اور اردو پڑھنا بھی شروع کیا۔

محترم امیر حلقہ مولانا مظہر الحق صاحب سے ابھی تک ایک دو دفعہ ہی ملاقات ہوئی تھی۔ موصوف میری تربیت اور ہمت و حوصلہ افزائی پر خاص توجہ رکھتے تھے اور کسی دوسری جیل سے خط ارسال فرمایا کرتے۔ چوں کہ میں بالکل نو وارد اور ناتجربہ کار تھا اور عمر بھی ایسی ہی تھی اس لیے شاید مولانا کو شبہ لاحق ہوا کہ دیوبند اور مظاہر کا یہ مولوی جیل کی فضا سے متاثر ہو کر صوم الدہر، چلہ کشی یا عملِ سفلی جیسی چیزوں میں مبتلا نہ ہو جائے، ایک خط ارسال فرمایا جس میں لکھا تھا کہ جیل میں B کلاس کی سہولت حاصل ہے اس لیے اسے تم ضرور استعمال کرو یعنی طبیعت سے کھاؤ پیو اور عبادات کے پہلو سے فرائض، واجبات اور سنت کی حد تک تو ضرور اپنے کو مصروف رکھو اور بس..... پانچ چھ مہینہ بعد DIR کے رفقار ہا ہونے لگے تو موصوف نے اس موقع پر بھی مجھے اطلاعاً خط لکھا کہ اب آپ کی بھی باری آنے والی ہے۔ اور جب معاملہ لمبا ہوا تو میں نے مولانا کو شکایتاً لکھا کہ آپ کی پیشین گوئی ظاہر نہیں ہوئی۔ موصوف کا جواب آیا کہ مولوی صاحب یہ راجستھان ہے یہاں مانسون بالکل اخیر میں آتا ہے جس سے مستفیض ہونے کے لیے صبر و حوصلہ کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا اس دور ظلمات نے سب سے زیادہ شہر کی مسلم قوم کو مرعوب ومتاثر کیا تھا' چناں چہ پورے ۲۲ ماہ میں شہر سے کوئی تعاون اور ہمدردی کا اظہار نہ ہونا بلکہ مدرسہ سے بھی پروانہ معزولی جاری کر دینا مرعوبیت کی بین دلیل تھی۔ اس کے برعکس غیر مسلم برائے نام ہی محبوس تھے۔ کئی بہانوں سے وہ دونوں وقت سرکاری ہسپتال جاتے اور دھڑلے سے اپنا گھر بار اور کاروبار سنبھالتے' بقیہ وقت بیرک مہمان خانہ کا منظر پیش کرتا۔ اس کے بالمقابل جب وہ میری تنہائی اور بے بسی کو دیکھتے تو بہت متاثر ہوتے۔ مجھے یہ پیش کش کی گئی کہ میں راجستھان یا کم از کم جودھ پور چھوڑ دوں تو مجھے رہا کیا جا سکتا ہے اور میں نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ راجستھان میرا وطن ہے جسے میں کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ پھر کہا گیا کہ قاری محمد طیبؒ صاحب کا وہ بیان جونس بندی سے متعلق شائع کرایا گیا ہے تم بھی اس کی تائید کر دو تو کچھ بات بن سکتی ہے' جب کہ اُن کے اپنے بہت سارے مشیر مختلف حیلے بہانے سے مستعفی ہو کر رہائی حاصل کر رہے تھے' خاص کر اُس وقت کے شیر راجستھان وکیل گمان من لوڈھا، جنھوں نے غالباً دماغی خلل کے بہانے جن سنگھ سے مستعفی ہو کر جان بچانے کی کوشش کی تھی..... بہر حال صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ لوگ میرے معاملات سے متاثر تھے بلکہ جب والد صاحب مرحوم کی بیماری کے سبب پیرول پر میری رہائی ہوئی اور بہار ٹرانسفر کیا گیا تو پواچند وکیل سندھی نے اپنے تمام رفقا سمیت میرے لیے وداعیہ اجتماع رکھا اور اپنے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا کہ مجھے اور آپ سب کو ان مولبی صاحب سے پریرنا لینی چاہئے کہ اس اکیلے شخص نے پورے جیل کو کس قدر پر بھاوت کیا اور ہم سب کے لیے کتنا اونچا آدرش اور معیار چھوڑے جا رہا ہے۔ ایمرجنسی ختم ہونے اور جماعت کے بحال ہونے کے بعد بحیثیت ناظم علاقہ جب بہار سے واپس جے پور اور جودھ پور پہنچا تو صوبائی الیکشن کا مرحلہ شروع ہونے والا تھا، مرکز میں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور یہی کیفیت صوبے میں بھی تھی اس لیے جنتا پارٹی کی طرف سے حصول ٹکٹ کی ہوڑ مچی ہوئی تھی۔ کامیابی اور منسٹری یقینی دکھائی دے رہی تھی لیکن جودھ پور سے جنتا پارٹی کا کوئی مسلم امیدوار نہ تھا۔ اس ماحول میں جیل کے غیر مسلم دوستوں نے مجھے دیکھا تو پیشگی مبارک باد دینے لگے اور کہا کہ تم تو جہاں سے کھڑے ہو گے بلا مقابلہ کامیاب ہو گے، بتاؤ کہاں سے

کھڑے ہو رہے ہو؟ جواب میں میں نے جب یہ کہا کہ میری جماعت ابھی انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لیتی تو انہیں بڑا تعجب ہوا اور انہیں گویا میری سادہ لوحی پر بڑا ترس آیا۔ کہنے لگے اچھا چلو میری حمایت میں تقریریں تو کرو گے نا؟ میں نے کہا کہ افسوس کہ میں ایسا بھی نہیں کر سکتا اور میں تحریکی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔

رب کی راہ میں جیل گئے

❑ محمد عبدالغفار
نظام آباد (آندھراپردیش)

۱۴ر جولائی ۱۹۷۵ء جمعہ کا دن تھا۔ میں صبح ۵ بجے بیدار ہوا اور مسجد جا کر نماز فجر ادا کی۔ درس حدیث ہوا اور اس کے بعد مطالعہ قرآن میں مصروف ہو گیا۔ آج جمعہ تھا خطبہ دینا تھا اس لیے دیر تک تیاری کرتا رہا۔ آٹھ بجے ہمارے ایک رفیق جناب محترم سید محمد صاحب صبح ہی سے ساتھ تھے اور اپنے انفرادی مطالعہ میں مصروف تھے، وہ بھی فارغ ہو کر آئے۔ ہم آپس میں حالات پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ پھر اس کے بعد اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ساڑھے بارہ بجے میں مسجد پہنچا، سنّتوں سے فارغ ہو کر خطبہ کے لیے ممبر پر کھڑا ہو گیا۔ آج سورہ احزاب کے آخری رکوع کی پہلی آیت کا خطبہ دینا تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو آزمائشیں آئی تھیں ان کا ذکر تھا۔ میں آزمائشیں بیان کئے جا رہا تھا اور خیال آ رہا تھا کہ پیغمبروں نے راہِ حق میں کیا کیا تکالیف برداشت کیں، مگر وہ صبر سے کام لیتے ہوئے دین حق کا پرچم لہراتے رہے۔ آخر کار اللہ نے مدد فرمائی اور وہ کامیاب ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر گھر پہنچا، جلگاؤں سے آیا ہوا ایک خط پڑھا جس میں امیر جماعت اور مرکز کے ذمہ داروں کی گرفتاری کی خبر تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آخر ملک کے موجودہ حالات سے جماعت کا کیا تعلق؟ میں نے اپنی اہلیہ سے ذکر کیا تو وہ بھی تعجب کرنے لگیں، پھر میں نے کہا خدانخواستہ کہیں ہماری باری نہ آجائے۔ وہ بیچاری کچھ پریشان ہو گئیں اور پھر کچھ دیر کے بعد کہنے لگیں اللہ تعالیٰ آپ کو محفوظ رکھے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو بھی گیا تو

انشاءاللہ میں اور یہ بچے اپنے رب سے مدد طلب کریں گے اور صبر سے کام لیں گے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے دفتر جماعت پر آیا۔ کوئی ساڑھے پانچ بجے کا وقت تھا اچانک کچھ قدموں کی آوازیں آئیں، چند ہی لمحوں میں سرکل انسپکٹر پولیس اور سب انسپکٹر اور کئی پولیس کے جوان وغیرہ دفتر میں آئے۔ سرکل انسپکٹر نے فرمایا کہ یہاں کون کون ہیں؟ میں نے کہا کہ آپ کو کیا مطلوب ہے؟ جواب دیا کہ آپ ہی مطلوب ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، محمد علی صاحب کو دفتر کا چارج دیا اور کہا میرے آنے تک آپ امیر رہیں گے اور چابیاں حوالے کر دیں۔ لیکن سرکل انسپکٹر صاحب نے کہا کہ سب لوگ ہمارے ساتھ چلیں گے، آپ تمام لوگ پولیس کی حراست میں آچکے ہو۔ میں نے کہا جناب! یہ تین آدمی جناب سید یوسف صاحب کرہنگر اور غوث محی الدین صاحب اور عبدالقیوم صاحب کورٹلہ باہر مقام کے ہیں ان حضرات کو چھوڑ دیجئے مگر انھوں نے انکار کر دیا اور میں خاموش ہو گیا۔ اسی اثناء میں ہمارے رفیق سید یوسف صاحب کسی کام سے آگئے اور پولیس نے انہیں بھی گھیرے میں لے لیا۔ بہر حال ہم تمام لوگ دفتر کے باہر نکلے، ہر طرف سے پولیس مسجد کو گھیرے ہوئے تھی۔ ہم مسجد سے باہر نکلے تو دو یا تین ہزار آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ہم چھ آدمی پولیس کے ساتھ عوام کی کثیر تعداد کی موجودگی میں چوراہے پر جہاں پولیس کی موٹر کھڑی ہوئی تھی لائے گئے اور موٹر میں بیٹھ کر پولیس ٹاؤن نمبرا پہنچائے گئے۔ یہ ساڑھے چھ بجے شام کا وقت تھا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے آتے ہی دفتر پر پولیس کا پہرا لگا دیا گیا ہے، کوئی بھی دفتر کے قریب نہیں جاسکتا۔

ہم چائے پی رہے تھے کہ پولیس کی گاڑی ہمارے ناظم ضلع جناب مولوی عبدالرزاق صاحب کو لے کر آگئی۔ تمام رفقا نے مل کر مغرب باجماعت ادا کی اور مالک سے استقامت کی دعا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر دیکھا کہ کچھ اور لوگوں کو بھی ایک ایک کر کے لایا جا رہا ہے جو بعض غیر مسلم جماعتوں کے افراد تھے جن میں کمیونسٹ طلباء تنظیم کے تین افراد، آر ایس ایس کے تین آدمی، ایک نکسلائیٹ ایڈوکیٹ اور ایک کانگریسی بھی شامل تھے۔ یہ عمل ۱۱ بجے رات تک جاری رہا۔ ۱۱ بجے کھانے کی اجازت لے کر ہمارے رفیق اسلم صاحب کے

ہوٹل سے کھانا منگوایا گیا اور تمام ساتھیوں کے ساتھ ہم کھانے سے فارغ ہوئے۔ یہ بات اب معلوم ہوئی کہ جماعت اسلامی ہند، آر۔ایس۔ایس اور دیگر ۲۴ جماعتوں پر پابندی عاید کر دی گئی ہے اور یہ تمام کارروائی اسی ضمن میں ہے۔ پھر تمام رفقا نے مل کر نماز عشاء با جماعت ادا کی۔ اسی دوران میں ڈی ایس پی صاحب آ گئے اور تمام لوگوں کے نام اور جماعت سے تعلق کی نوعیت وغیرہ نوٹ کرتے رہے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ اپنے آفس چلے گئے۔ یہ تمام کارروائی رات ۱۲ بجے تک ہوتی رہی۔ اس دوران میں رفقاے جماعت کی آمد و رفت ہوتی رہی۔ سننے میں آیا تھا کہ ہمیں راجمنڈری لے جایا جائے گا۔ اسی خیال سے تمام لوگوں نے اپنے اپنے گھروں سے ضروری سامان وغیرہ منگوالیا۔ ایک بجے رات سرکل انسپکٹر نے مجھے طلب کیا اور کہا کہ دفتر کی چابیاں دے دیجیے، میں نے کہا دفتر سے کیا مطلوب ہے؟ لیکن سرکل انسپکٹر صاحب نے کہا کہ آپ صرف چابیاں دے دیجیے۔ میں نے کہا کہ چابیاں گھر پر ہیں اور چابیوں کے لیے میرا گھر چلنا ضروری ہے۔ ایک بجے رات مجھے پولیس والے گاڑی میں میرے گھر لے گئے۔ پیچھے پیچھے ڈی سی پی صاحب کی موٹر بھی آ رہی تھی۔ میں نے اہلیہ کو دلاسا دیا اور صبر کی تلقین کر کے پولیس کے ساتھ چابیاں لے کر دفتر جماعت پر پہنچا۔ دفتر کھولا گیا۔ وہ لوگ سامان اٹھانا چاہتے تھے۔ انھوں نے تمام سامان جو میں نے اور ہمارے ساتھیوں نے پندرہ برس میں ایک ایک پیسہ جوڑ کر جمع کیا تھا، بڑی بے دردی سے موٹر میں ڈال کر اور تمام چیزوں کو برباد کرتے ہوئے رات تین بجے ٹاؤن پہنچایا گیا۔ چار بجے کے بعد دو اور رفیق یعنی سید یعقوب علی صاحب اور محمود بیگ صاحب لائے گئے۔ جماعت کے ہم سب رفیقوں نے نمازِ با جماعت ادا کی اور استقامت کی دعا کرتے رہے کہ مالک ہم لوگ بہت کمزور ہیں، ایمانی حیثیت سے بھی اور طاقت کے اعتبار سے بھی، تو ہی ہمارا واحد سہارا ہے اور تو ہی ہمارا بہتر وکیل ہے، ہم تمام معاملات تیرے حوالے کرتے ہیں اور تجھ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ صبح فجر کے بعد ہی ہمارے رفیق محترم اسلم صاحب نے سب کے لیے چائے روانہ کر دی۔ بعد ناشتہ بھی بھجوا دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے کاروبار میں ترقی دے۔ دس بجے کے بعد اخبارات ملے۔ پورے ملک میں جماعت اسلامی کے رفقا کے

گرفتار ہونے اور دفاتر کو سیل کرنے کی خبریں پہلے صفحہ پر شائع ہوئی تھیں۔ یہ بھی مالک کا کرم ہے کہ آج اخبارات نے جماعت اسلامی کی خبروں کے لیے اپنا پہلا صفحہ دیا حالانکہ جماعت کا بڑے سے بڑا اجتماع ہوا اور بڑے بڑے تحریکی کام ہوئے مگر کبھی ان اخبارات کو صفحہ اول پر جماعت کی خبریں شائع کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ اللہ کے فضل سے اقامتِ دین کی اس تحریک کو پورے ملک میں متعارف ہونے کا موقع ملے گا۔ بہر حال ۵/جولائی ہفتہ کا دن گزر رہا تھا اور رفقاے جماعت ٹاؤن میں آکر مل رہے تھے اور خبریں معلوم ہو رہی تھیں۔ ۳/بجے ڈی ایس پی صاحب تشریف لائے اور آتے ہی سرکل انسپکٹر کو ڈانٹنے لگے کہ ان لوگوں کو کیوں لاکپ میں نہیں ڈالا گیا؟ اور حکم دیا کہ فوری انہیں لاکپ میں بند کر دو۔ بڑی کشمکش کا وقت تھا کیوں کہ لاکپ انتہائی چھوٹا اور گندگی سے بھرا ہوا تھا، جس میں ۲۱ آدمیوں کو رکھا جا رہا تھا۔ عین اسی وقت مجھے ایک اور آزمائش سے گزرنا پڑا۔ میرے دو بچے آکر ٹاؤن کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بابا کہہ کر پکارنے لگے۔ انہیں پولیس والے ڈرا رہے تھے لیکن معصوم بچوں کو یہ تمام حالات کیا معلوم، وہ مسلسل پکارتے جا رہے تھے اور رو رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو سہارا دیا۔ اتنے میں ایک رفیق آکر بچوں کو لے کر چلے گئے اور مجھے بڑا سکون ہوا۔

ہم نے ڈی سی پی صاحب سے کہا کہ جناب ہم کو یہاں لائے ہوئے قریب چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں، ہمیں فوری عدالت میں پیش کیا جائے تو مناسب رہے گا۔ اس نے فوری مختلف الزامات عاید کر کے شام چھ بجے عدالت روانہ کر دیا اور ہم جج صاحب کے سامنے پیش کیے گئے۔ جج صاحب نے کہا کہ کل صبح دس بجے ان کو پیش کیا جائے۔ لہٰذا پھر ٹاؤن آ گئے۔ تمام رفقا نے نماز عشاء باجماعت ادا کی۔ اب گھروں سے کھانا بھی آ گیا تھا۔ ہم کھانے سے فارغ ہوئے۔ دوسرے دن صبح ہی ناشتہ آ گیا اور ساتھ ہی ہم سب کے بچے بھی آ گئے اور ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔ پھر دس بجے دن میں عدالت میں پیش کیا گیا اور جج نے پندرہ دن کے لیے ریمانڈ کر دیا۔ ہم نے اپنے آفس کے سامان کے بابت دریافت کیا تو سرکل انسپکٹر نے کہا کہ وہ محفوظ رہے گا۔ ہم نے جج صاحب سے کہا کہ ہمارے سامان کا پنچ

نامہ نہیں کیا گیا ہے لہٰذا سامان کا پنچ نامہ کیا جائے یا سامان عدالت کے پاس محفوظ رکھا جائے۔ جج صاحب نے نوٹ کر لیا۔ ہمیں نظام آباد جیل روانہ کر دیا گیا۔ بہت سے رفقا ہمیں رخصت کرنے کے لیے آئے، ہم سب کو خدا حافظ کہہ کر جیل روانہ ہو گئے۔ جیل میں تمام سامان چھوڑ کر اندر داخل ہونا پڑا۔ ہمیں بیرک نمبر ۹ دی گئی۔ جیلر راج ریڈی بہت اچھا آدمی تھا۔ اس نے آتے ہی سب سے مصافحہ کیا اور کہا کہ آپ لوگوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہو ہمیں بتا دیجیے۔ ہم نے کہا کہ آپ ہمیں گھر سے کھانا منگوانے کی اجازت دیجیے۔ اس نے فوری اس کی اجازت دے دی اور روزانہ ۲ لیٹر دودھ بھی ہمارے لیے مقرر کر دیا۔ ہم نے اپنے اپنے گھر والوں کو اطلاع دے دی کہ وہ صبح اور شام کھانا روانہ کریں۔

۶ر جولائی ۱۹۷۵ء کو ہم جیل میں داخل ہوئے تھے، بارش مسلسل ہو رہی تھی مگر اس کے باوجود ہمارے رفقا کھانے اور تمام ضروریات کی چیزیں فراہم کرتے رہے۔ اسی اثناء میں یہ معلوم ہوا کہ ہماری ضمانت ہو سکتی ہے۔ چناں چہ تیسرے دن ضمانت کی کارروائی شروع ہو گئی اور تقریباً آٹھ دن بعد چار آدمی کی ضمانت آ گئی جن میں میں، ناظم ضلع صاحب اور دوسرے ۲ رفقا شامل تھے اور پانچ آدمیوں کی ضمانت نامنظور ہو گئی۔ ہم ۱۱ر جولائی ۱۹۷۵ء کو شام میں جیل سے باہر نکلے۔ باہر ہمارے بہت سارے رفقا موٹر لیے کھڑے تھے، سب سے مل کر اپنے اپنے گھر موٹر کے ذریعہ پہنچا دیے گئے۔ میں گھر پہنچا تو بڑی بہن گھر میں موجود تھیں۔ دیکھتے ہی رونے لگیں۔ بچے تمام دوڑتے ہوئے آ کر لپٹ گئے۔ میں نے تمام کو دلاسا دیا اور کہا اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی تھی جو پوری ہوئی۔ مالک نے آزاد کر دیا۔ اب رات تک لوگ کثرت سے ملاقات کے لیے آتے رہے۔

رات گزر گئی، اگلے دن صبح سے ہی ہمارے جیل کے رفیقوں کے رشتہ داروں نے آ آ کر تنگ کرنا شروع کر دیا، کہنے لگے اچھے ذمہ دار لوگ ہیں آپ بھی۔ خود تو باہر آ گئے اور ساتھیوں کو اندر ہی چھوڑ آئے! میں نے سب کو دلاسا دیا اور کہا کہ صبر کرو انشاء اللہ سب لوگ آ جائیں گے۔ اگلے دن ہمارے محترم رفیق قمر الدین صاحب جو دواخانے میں تھے ان سے ملاقات کی۔ وہاں سے نکل کر مسجد آیا اور مغرب کی نماز سے فارغ ہوا تو معلوم ہوا کہ

ناظم ضلع کو گرفتار کرلیا گیا ہے اور اب پولیس میری تلاش میں ہے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس گھر پہنچی تو میں کھانا کھا رہا تھا۔ میں نے پولیس والوں سے کہا کہ وہ بھی کھانے میں شریک ہوجائیں مگر انھوں نے شکریہ پر اکتفا کیا اور کہا کہ آپ آرام سے کھانا کھالیجیے۔ میں نے اُن لوگوں کی چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ وہ لوگ بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے جناب ہم گرفتاری کے لیے کہیں بھی جاتے ہیں تو لوگ پریشان ہوجاتے ہیں مگر آپ لوگ بھی عجیب ہیں۔ اطمینان سے خاطر کرتے ہوئے اور سکون سے چلنے کو تیار ہیں۔ ۱۵/ جولائی کو ساڑھے نو بجے شب پولیس کے ساتھ دوستوں سے ملتے ہوئے ٹاؤن نمبر ا میں سرکل انسپکٹر سے ملاقات کے بعد اندر داخل ہوا، وہاں جماعت کے ناظم ضلع، دو اسمگلر، تین کمیونسٹ پارٹی کے افراد اور طلباء گروپ کے تین لڑکے جو ہمارے ساتھ جیل میں تھے لائے گئے، ان لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ۱۱/ بجے شب حیدر آباد کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ اطمینان تھا کہ ہم گناہ گار بندوں کو رب کی راہ میں جیل جانے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ ۵/ بجے صبح چنچل گوڑہ جیل پہنچ کر سامنے پولیس گارڈ روم میں ہم کو ٹھہرایا گیا۔ نماز فجر ادا کی۔ ۷/ بجے ہمارا انسپکٹر آیا اس نے خبر دی کہ یہاں جیل میں جگہ نہیں ہے اس لیے مشیر آباد جیل جانا ہے چناں چہ ہمیں مشیر آباد جیل لایا گیا۔ یہاں ۱۶/ جولائی کو ۱۱/ بجے جیل میں داخل کیا گیا۔ یہ بھی بہت بڑی جیل ہے، اس میں 800 تا 1000 آدمی رہ سکتے ہیں۔ ضروری کارروائی کے بعد بیرک نمبر ۵ ہمیں دی گئی بی کلاس میں داخلہ ملا اور حسبِ ضابطہ تمام ضروری سامان فراہم کیا گیا۔ ہمارے آنے سے پہلے تقریباً ۷۰ لوگ نظر بند ہو چکے تھے، جس میں جماعت اسلامی کے علاوہ رائل سیما کے بھی تین رفقا شامل تھے۔ آنند مارگ آر۔ ایس۔ ایس جن سنگھ، سوشلسٹ پارٹی اور نکسلائیٹ وغیرہ کے تمام نظر بندوں سے ملاقاتیں رہیں۔

پروگرام بالترتیب یوں تھا۔ صبح فجر کے بعد ورزش، انفرادی مطالعہ قرآن، چائے نوشی، درس قرآن مجید جس میں ہمارے رفقا کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ اس کے بعد ناشتہ ہوتا، ناشتے کے بعد اخبارات کا مطالعہ پھر لٹریچر کا مطالعہ، اس کے بعد دوپہر کا کھانا اور عصر تک آرام اور عصر کے بعد تبادلہ خیال کی نشستیں۔ ایک بار تمام جماعتوں

کے لوگوں نے مل کر ایک جلسہ منعقد کیا جس میں جماعت اسلامی کا تعارف رکھا گیا تھا۔ الحمد للہ بڑی تفصیل سے جماعتِ اسلامی ہند اور دین اسلام کا تعارف کرایا گیا۔ یہ سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا رہا۔ چند دنوں کے بعد یہاں ایک اور رفیق جناب سید یعقوب علی صاحب اور پھر عبدالرحیم خاں صاحب نندیال بھی لائے گئے۔ دن گزرتے رہے اور کوئی نہ کوئی پروگرام رہتا اور نئے لوگ داخل ہوتے رہتے۔ اس دوران ایک واقعہ پیش آیا۔ یہاں جیل میں دو نکسلائٹ تھے جن کو پھانسی کی سزا ہوگئی تھی اور معلوم ہوا تھا کہ عنقریب پھانسی ہونے والی ہے۔ تمام نظر بندوں نے یہ طے کیا کہ پھانسی کی سزا منسوخ کروائی جائے لہٰذا بھوک ہڑتال کرنے کا پروگرام بنا۔ لوگوں نے ہم سے کہا کہ ہڑتال میں ہم بھی شریک ہو جائیں۔ ہم نے کہا کہ جہاں تک مشترکہ مسائل ہیں ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں، مگر اصولی مسائل کے خلاف ہم ساتھ نہیں دے سکتے۔ ان لوگوں نے بھوک ہڑتال کی اور ہم لوگ الگ رہے اور اس ہڑتال سے پھانسی کی سزا کچھ دنوں کے لیے ملتوی ہوگئی۔ تھوڑے دنوں بعد پھر تمام لوگوں کے کچھ مشترکہ مطالبات۔ اس مرتبہ طے ہوا کہ ۱۵/اگست کو جو آزادی کا دن ہے یوم سیاہ منایا جائے چناں چہ بھوک ہڑتال بھی کی گئی اور ایک جلسہ بھی منعقد ہوا جس میں اپنی اپنی جماعت کا تفصیلی تعارف کرایا گیا۔ اس میں آر۔ ایس۔ ایس والوں نے حصہ نہیں لیا۔ ۱۴/ رمضان شریف کو جیل کے دوسرے ساتھی چھوٹ گئے اور صرف جماعت اسلامی کے رفقا ہی رہ گئے۔ لیکن ساتھ ہی عبدالحفیظ خان صاحب اور حافظ انوار اللہ محمود صاحب گرفتار ہو کر ہمارے پاس آ گئے۔ ہم تمام رفقا اطمینان سے ماہ صیام گزارنے لگے۔ انگریزی زبان سیکھنے کا پروگرام بنایا گیا۔ میں، حافظ صاحب اور دوسرے ساتھی، ہمارے ضلع کے ایک آفیسر رسول صاحب سے انگریزی سیکھنے لگے جو ہماری طرح نظر بند تھے۔ ایک دن اہلیہ اور بچے ملاقات کے لیے آئے، خیریت معلوم کر کے اطمینان ہوا۔ یہ پہلی ملاقات تھی جو تقریباً پانچ مہینے بعد ہوئی۔ مختلف پروگراموں اور خیالات کے تبادلے کی نشستیں روز ہی منعقد ہوتیں رہیں۔ کبھی ہم لوگ اظہار خیال کرتے اور کبھی آر۔ ایس۔ ایس کے لوگ اور اسی طرح جن سنگھی، کبھی آنند مارگی اور نکسلائٹ کو بھی موقع ملا۔ اس طرح ایک دوسرے

کو سمجھنے میں مدد ملی۔ خاص طور پر اللہ کے فضل سے اسلام اور تحریک اسلامی کے تعارف کا اچھا موقع ملا۔ ہم نے اپنی حد تک یہ فریضہ انجام دینے کی کوشش کی۔ نومبر ۱۹۷۵ء میں آر۔ایس۔ایس نے گورنمنٹ کے سامنے کچھ مطالبات رکھے اور نوٹس دی گئی کہ اگر جماعتوں پر سے پابندی نہیں ہٹائی گئی تو پورے ملک میں پانچ لاکھ افراد گرفتاری پیش کریں گے۔ حکومت اپنی طاقت اور اقتدار کے نشے میں چور تھی، وہ کسی کی کیا سنتی! ۲۶/ جنوری ۱۹۷۶ تک گرفتاریاں اور رہائیاں ہوتی رہیں اور کچھ ہمارے رفقا کی بھی گرفتاریاں اور رہائیاں عمل میں آئیں۔

یکم دسمبر ۱۹۷۶ء کو ہماری جیل میں دو آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ ہماری بیرک پھانسی گھر کے قریب تھی۔ پھانسی کے وقت دونوں مجرم خدا کو پکارنے لگے، اس سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ آدمی زندگی بھر کتنا ہی خدا کا انکار کرے مگر آخر کار خدا ہی کو پکارتا ہے۔

نظام آباد سے جملہ ۱۰/ افراد گرفتار ہوئے جس میں ۹/ ارکان اور ایک کارکن تھے جن کے نام اس طرح ہیں:

۱) محمد عبدالرزاق، ناظم ضلع، نظام آباد، ۲) محمد عبدالغفار، امیر مقامی، نظام آباد ۳) سید یعقوب علی صاحب، نظام آباد، ۴) صالح بن احمد بکران صاحب، امیر مقامی آرمور، ضلع نظام آباد، ۵) مرزا محمد بیگ صاحب، رکن جماعت، نظام آباد ۶) سید محمد علی صاحب، رکن جماعت، نظام آباد ۷) سید یوسف علی صاحب، رکن جماعت، نظام آباد ۸) غوث محی الدین صاحب، امیر مقامی کورٹلہ، کریم نگر ۹) احمد عبدالقیوم صاحب، رکن جماعت کورٹلہ، کریم نگر ۱۰) محمد یوسف صاحب، نومسلم، کارکن، ہنگرگہ۔

یہ تمام رفقا ابتدا میں DIR کے تحت گرفتار کیے گئے۔ بعد میں محمد عبدالرزاق صاحب، محمد عبدالغفار، سید یعقوب صاحب اور صالح بن احمد بکران صاحب ان چار رفقا کو DIR سے ضمانت پر رہا کیا گیا لیکن بعد میں میسا (MISA) کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ باقی تمام رفقا تقریباً دو مہینے بعد ضمانت پر رہا کردئے گئے۔

❀❀

جرأتِ رندانہ

□ ابومتین

سداسیوپیٹھ، ضلع میدک (آندھراپردیش)

ایمرجنسی کے دوران ملک جن حالات سے گزر رہا تھا، اُن پر لوگوں کی اکثریت حیران و پریشان تھی البتہ ایسے لوگوں کی بھی کوئی خاص کمی نہ تھی جو حکومت کے اقدامات کی تائید و حمایت میں بڑھ چڑھ کر بولے جارہے تھے۔ دراصل کچھ لوگ ہر اٹھے ہوئے ڈنڈے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایمرجنسی کے تحت جو کچھ ہو رہا تھا اُس سے زیادہ مزید بہت کچھ ہونے کی افواہیں پھیلائی جارہی تھیں۔ نتیجے میں دہشت کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ خود پولیس بھی جو عوامی جان و مال کی حفاظت پر مامور ہوتی ہے، اس موقع پر دہشت پھیلانے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ جماعت کے افراد کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جارہا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ کارکنانِ جماعت کو پوچھ گچھ کے بہانے ستایا جارہا تھا۔ اُن دنوں میں اپنے وطن سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر دور ایک گاؤں کے ہائی اسکول پر بحیثیت انچارج صدر مدرس کام کر رہا تھا۔ اصل صدر صاحب حیدرآباد کے رہنے والے تھے اور پرانے شہر کے ایک محلے کی آر۔ ایس۔ ایس شاکھا کے سنچالک بھی تھے۔ وہ بتاتے رہتے تھے کہ اُن کے چند عزیزوں کو بھی جیل بھیج دیا گیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے یہ بہت کم اسکول میں حاضر رہتے۔ ماہانہ تنخواہ کا بل بنانے اور بینک سے چک کیش کرانے کی حد تک اپنی ڈیوٹی انجام دیتے گویا اسکول چلانے کی مکمل ذمہ داری عاجز پر آ گئی تھی۔ اس لیے یہ مجھے بہت چاہتے تھے۔ گٹھے ہوئے اور فربہ تن وتوش کے ساتھ رونڈرناتھ ٹیگور کی سی ان کی

سفید داڑھی عجیب بہار دیتی تھی۔ عام صدور مدارس کے برخلاف ان کی شخصیت میں بعض باتیں بالکل نئی معلوم ہوتی تھیں جیسے قومی تقاریب یوم آزادی اور یوم جمہوریہ وغیرہ کے موقعوں پر پرچم کشائی ہوتی ہے اور سبھی لوگ ناریل پھوڑنے اور پوجا کی رسم ادا کرنے کو لازم گردانتے ہیں لیکن ہمارے صدر صاحب اس کے مخالف تھے۔ انھوں نے بس سیدھی سادی پرچم کشائی پر ہی اکتفا کیا۔ فیملی پلاننگ کی مہم تو ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، اپنے اصولوں پر ڈٹے رہنے کی جرأت رندانہ بدرجہ اتم موجود تھی، مگر بزدلی میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔

جب میں نے ان کو بتایا کہ کل اتوار کو انٹیلی جنس کے جمعدار صاحب میرے گھر آئے تھے اور کافی دیر تک پوچھ گچھ کرتے رہے تو یہ صدر صاحب گم صم ہو کر رہ گئے، حیرانی سے منہ کھولے سنتے رہے اور اچانک حیدرآباد لوٹ گئے۔ اُس وقت میں ان کی اس حرکت پر غور نہ کر سکا لیکن چند ہفتوں بعد دوبارہ وہی جمعدار صاحب ذرا کڑی باز پرس کرنے لگے تو میں نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔ الٹا انہیں سے سوالات کرتا رہا کہ پہلے مجھے یہ بتایئے یہ باتیں آپ نے کہاں سے حاصل کیں کہ میں نس بندی کے خلاف پروپگنڈہ کر رہا ہوں اور اجتماعات کر رہا ہوں وغیرہ۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ تب وہ اپنی آمد کے اصل مقصد پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ آپ کو اسکول کے ایک تلگو ٹیچر کے بارے میں انکوائری کر کے رپورٹ دینا ہے، اس لیے درمیانی آدمی کا کردار ادا کرتے ہوئے مسئلے کو سلجھا دیں تو ٹھیک رہے گا۔ میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ جمعدار صاحب کسی معقول رقم پر مسئلہ دبا دینے کے درپے تھے۔ خیر میں نے اس ٹیچر کے گھر کا پتہ بتا کر خاموشی اختیار کر لی اور جب میں نے صدر صاحب سے جمعدار صاحب کی آمد کے بارے میں بتایا تو گھبرا گئے اور مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ بے چارے ڈرتے ہیں۔

فیملی پلاننگ کے لیے نس بندی کیمپ، گاؤں گاؤں لگائے جا رہے تھے۔ ٹیچرز کو لازم کر دیا گیا تھا کہ ہر ایک اپنی طرف سے دو افراد کی نس بندی کروا کر ان کے سرٹیفکٹ پیش کرے۔ عدم تعمیل کی صورت میں سالانہ اضافہ تدریجی (Increament) روک دیا جا رہا تھا

اور افواہیں گرم تھیں کہ مستقبل میں سزائیں سخت سے سخت کر دی جائیں گی۔ راشن کارڈ چھین لینے اور ملازمت سے سبکدوش کر دینے تک کی دھمکی دی جا رہی تھی۔ دو دو افراد کی فراہمی کے لیے اساتذہ سرگرم عمل تھے۔ پندرہ کے اسٹاف پر ہم دو ذمہ داروں کا اتنا اثر تھا کہ ہم اس سلسلے میں ٹس سے مس ہوتے نظر نہ آ رہے تھے۔ سالانہ اضافہ تدریجی رک گیا تھا لیکن سبھی اس امید میں تھے کہ یہ ظلم و جبر کا دور ختم ہوگا۔ اسی سلسلے میں ضلع اور تعلقہ کے ذمہ داروں پر مشتمل ایک وفد گشت لگا رہا تھا۔ باز پرس کر کے ہر ہائی اسکول کے اساتذہ کو نس بندی پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ چناں چہ ایک دن ہمیں یہ خبر ملی کہ اُس قریبی گاؤں کے اسکول پر دھاوا بول دیا گیا ہے جہاں ہم لوگ کبھی کبھار بیڈمنٹن میچ کھیلنے جایا کرتے تھے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے سنٹر پلیئر خاں صاحب کو زبردستی لے جا کر آپریشن کر دیا گیا ہے۔ ہم اس واقعہ پر بہت رنجیدہ ہوئے۔ جب ہم چند ساتھیوں کے ساتھ خاں صاحب کی خدمت میں پرسہ دینے پہنچے تو ان کی باتیں معلوم کر کے انگشت بدنداں رہ گئے۔ خاں صاحب سے عہدیدار کا دوبدو مکالمہ کرنا بڑا عجیب لگا۔ عہدیدار نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارے کتنے بچے ہیں؟ تو بتایا گیا آٹھ بچے ہیں تب عہدیدار نے بڑی حقارت سے کہا ''کیا تم ان سب کو گھاس کھلا کر پرورش کرتے ہو؟'' خاں صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً جواب دیا ''اگر آپ اپنے بچوں کو گھاس کھلا کر پالتے ہیں تو میں بھی یہی کرتا ہوں سمجھ لو۔'' خاں صاحب کا یہ جملہ آفیسر کی انا پر بجلی بن کر گرا اور اس کا پارہ اس قدر چڑھ گیا کہ فوری طور پر کانسٹبلوں کے ذریعہ انھیں نس بندی کیمپ منتقل کر دیا گیا اور نہ جانے کس طرح آپریشن کرنے کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئے اور علاج کرتے کرتے چند برسوں میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اسی ہفتہ ہمارے اسکول پر چھاپا مارا۔ اُس دن اتفاقاً صدر صاحب موجود تھے، لیکن ہم لوگ جہاں سہمے ہوئے تھے وہیں اندر سے بے حد مشتعل بھی اور صدر صاحب کی ہدایت پر عمل کرنے کا بیڑا اُٹھائے ہوئے تھے۔ چناں چہ آفیسر کے سوالات پر صاف صاف جواب دیا گیا، لہجے میں ذرا برابر بھی لرزش نہ آئی۔ کسی نے کہا کہ ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی ہے، کسی نے کہا کہ ایک بچی ہے، شادی نہیں ہوئی،

کوئی اولاد نہیں وغیرہ۔ ایک صاحب جن کے سر کے بال کافی حد تک سفید ہو چکے تھے اُنہوں نے کہا کہ وہ بچے پیدا کرنے کی عمر پار کر چکے ہیں۔ جب عہدیدار نامراد لوٹ گئے تو خوب جشن منایا گیا۔

جتنی سکت، اتنی آزمائش

الطاف احمد
میسور (کرناٹک)

میسور سے میرا تبادلہ ریلوے ڈویژنل آفس ہبلی کے لیے 1959ء میں ہوا۔ میرے دفتر کے ایک ساتھی نے میری ملاقات ڈاکٹر ایس احمد صاحب سے کرائی جو ریلوے ہاسپٹل میں RMO تھے اور جماعت اسلامی ہند کے رکن بھی تھے۔ سوٹ میں ملبوس، چہرہ پر داڑھی اور لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ والی اس پرکشش شخصیت نے جو سراپا اخلاق اور ایک اچھا چلتا پھرتا نمونہ تھی، مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کے بعد میں نے جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ شروع کیا۔ میرا یہ تاثر بہت صحیح ثابت ہوا جب کہ برسوں بعد بلگام کے ایک رکن جماعت محمد یوسف غفار نے، مولانا عبدالحی صاحب مرحوم مدیر الحسنات سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا۔ مولانا محمد عبدالحی صاحب کے ایک سوال کا انھوں نے یہ جواب دیا تھا کہ لٹریچر کے مطالعہ سے وہ جماعت سے متاثر ہوئے۔ پھر عبدالغفار صاحب نے یہی سوال محمد عبدالحی صاحب سے کیا تو ان کا جواب تھا کہ بھئی ہم تو جماعت کے ارکان و اکابرین کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر جماعت سے قریب ہوئے۔

ہبلی میں اس وقت صرف دو ارکان ڈاکٹر شیخ احمد صاحب اور جناب شیخ صاحب مرحوم تھے۔ ان دنوں شہر میں جماعت کی سخت مخالفت ہو رہی تھی اس کے باوجود مخالفین تک بھی ان کے اخلاق و کردار کے مداح تھے۔

اسی دوران ۱۹۶۵ء میں ہند و پاک جنگ ہوئی۔ یہ دونوں ارکان ڈیفنس آف انڈیا

رولز کے تحت گرفتار کر لیے گئے اور تقریباً چھ ماہ نظر بند رہے۔ اُس وقت سے میرے دل میں یہ بات جاگزین تھی کہ یہ مرحلہ کسی وقت بھی جماعت کے کارکنوں کو پیش آسکتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں میری رکنیت منظور ہوئی کیوں کہ میں اپنے آپ کو رکنیت کے معیار سے کمتر سمجھتے ہوئے درخواست دینے میں تاخیر کرتا رہا تھا۔ اس وقت سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد سراج الحسن صاحب حلقہ کے نائب وگوا کے امیر تھے۔

۲۶ر جون ۱۹۷۵ء ہندوستان کی تاریخ کا وہ منحوس دن تھا جب کہ اندرا گاندھی نے اپنی کرسی بچانے کے لیے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ امیر مقامی محترم ڈاکٹر ایس احمد صاحب نے ارکان جماعت کی خصوصی نشست بلوائی اور کہا کہ یہ مرحلہ کسی بھی رکن جماعت کو پیش آسکتا ہے، دُعا کرتے رہنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ ہم سب کو ثابت قدم رکھے۔

۲ر جولائی ۱۹۷۵ء کو ہندوستان کی مختلف ۲۶ جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا جن میں جماعت اسلامی ہند بھی شامل تھی۔ ۴ر جولائی کو جمعہ کے دن صبح ساڑھے آٹھ بجے دو انسپکٹر اور چند لوگ میرے گھر آئے اور مجھے پولیس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ اس وقت میرے میز پر کلدیپ نیر کی Between The Lines کتاب رکھی ہوئی تھی جو میرے زیر مطالعہ تھی۔ انسپکٹر نے اس کتاب کو ادھر ادھر پلٹ کر دیکھا اور رکھ دیا (کلدیپ نیر بھی ایمرجنسی میں نظر بند کئے گئے تھے) مجھے DSP کے سامنے پیش کیا گیا۔ خدا تعالیٰ نے میرے قلب پر طمانیت کا پردہ ڈالا اور DSP کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پولیس آفیسر نے میرا نام اور پیشہ پوچھنے کے بعد مجھ سے سوال کیا کہ میرا تعلق کس جماعت سے ہے؟ میں نے کہا کہ جماعت اسلامی ہند سے۔ کس عہدہ پر فائز ہو؟ میں نے جواب دیا ناظم ہوں۔ جھٹ سے قریب میں کھڑے ہوئے کسی شخص نے کہا کہ یہ رکن ہیں۔ میں خاموش رہا۔ بیچارے کو رکن اور ناظم کا فرق معلوم نہیں تھا۔

ہبلی میں DIR کے تحت کل آٹھ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ جماعت کے پانچ افراد میں چار ارکان تھے اور ایک متفق جناب سید حسین ملا تھے جن کو ان کے بیٹے ملا لیاقت احمد جو

رکن جماعت تھے سمجھ کر گرفتار کرلیا گیا تھا۔امیر مقامی ڈاکٹر ایس احمد صاحب کو پونا میں گرفتار کیا گیا اور بعد میں انہیں ہبلی جیل لایا گیا۔

آدھی رات میں ہم کو ہبلی جیل بھیج دیا گیا۔ میں اور میرے ایک ساتھی جناب محمد غوث کنگیری ریلوے ملازم تھے۔سروس کے قوانین کے مطابق حراست میں لینے کے ۲۴ گھنٹوں کے اندر ڈپارٹمنٹ کو اطلاع دینا لازمی تھا۔ پوسٹ کارڈ کے ذریعہ ہم نے ڈپارٹمنٹ کو اطلاع دے دی اور ہم دونوں سروس سے معطل کردئے گئے۔

جس وقت میری گرفتاری ہوئی میری تیسری لڑکی ۳ ماہ کی تھی۔ بیوی کے علاوہ خاندان کا کوئی فرد گھر پر موجود نہیں تھا۔ رفقاے جماعت اور ہندو مسلم پڑوسیوں نے میرے اہل خانہ کا خیال رکھا اور پوری ہمدردی کا مظاہرہ کیا جس کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ میری بیوی نے بھی دوران حراست رفیقہ حیات کا حق ادا کیا، صبر وتحمل اور قناعت کا مظاہرہ کیا۔ خدا تعالیٰ ان سب کو بہترین اجر عطا فرمائے۔

اب قانونی کارروائی کا مرحلہ سامنے تھا۔ خوف ودہشت کا ماحول تھا، چناں چہ کیل کے ایک ہمدرد جماعت وکیل کبیر صاحب سے رہنمائی حاصل کی گئی۔ انھوں نے ضمانت پر رہائی کے لیے پنجاب اور بمبئی ہائی کورٹ کے فیصلوں کا حوالہ دیا جس میں واضح انداز میں کہا گیا تھا کہ کسی بھی جماعت کو غیر قانونی قرار دینے سے پہلے کی کارروائیوں کو غیر قانونی قرار نہیں دیا جا سکتا اور جب کوئی جماعت غیر قانونی قرار دی جاتی ہے تو اس کی رکنیت خود بخود معطل ہو جاتی ہے اور وہ اس جماعت کا ممبر نہیں رہتا۔ اس بنیاد پر ہماری رہائی ضمانت پر ہوگئی۔

دوسرا عجوبہ یہ ہوا کہ یہی دلائل پیش کرنے کے باوجود محترم امیر مقامی اور جناب شیخ صاحب کی ضمانت پر رہائی کی درخواست رد کردی گئی۔ ان دونوں کا کیس دوسرے کورٹ میں تھا۔ بعد میں ان دونوں پر مقدمہ چلا اور کیس خارج کردیا گیا، لیکن اگلے ہی دن ان کو میسا کے تحت گرفتار کر کے بلاری سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

ضمانت پر رہا ہوئے ابھی دو ماہ گزرے تھے کہ ۱۳/نومبر ۱۹۷۵ء کو اپوزیشن پارٹیوں

نے ایمرجنسی کے خلاف احتجاج کا پروگرام بنایا تو پھر سے مجھے اور جناب محمد غوث کنگیری صاحب کو گرفتار کرلیا گیا۔ گھر سے جاتے ہوئے میں نے بیوی سے کہا کہ پھر سے بلاوا آیا ہے اور میں جارہا ہوں تو اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر خدا حافظ کہا۔

ہم نے شدید سردی میں اوڑھنے کے بغیر ایک رات جیل کے ایک کمرے میں گزاری۔ ہمارے ساتھ کرناٹک اسٹیٹ کے آر۔ایس۔ایس کے صدر ڈاکٹر گجیندر گڑ کر بھی تھے۔ دوسرے دن شام میں ہم کو بلاری سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے، جیل کے ساتھیوں نے استقبال کیا اور کہا کہ ہم اپنی اپنی پسند کا کمرہ منتخب کرلیں۔ اس وقت قیدیوں کی تعداد کم تھی۔

بلاری سنٹرل جیل کرناٹک کی بہترین جیل ہے جس کے اندرونی حصہ میں ۳۰ تا ۴۰ کمرے Attach Bathroom کے ساتھ بنگلہ دیش کے افسر قیدیوں کو رکھنے کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ یہاں پر آر۔ایس۔ایس والوں نے میس کا بہترین انتظام کیا تھا۔ کھانے اور چائے کے وقت گھنٹی بجتی اور ہم Dining Hall پہنچ جاتے۔ آر۔ایس۔ایس کے لوگ کھانے سے پہلے سنسکرت کے چند سلوگن زور زور سے کہتے۔

جیل میں قیدیوں کو ذہنی اذیت بھی دی جاتی۔ گھر کے خطوط ہم تک نہیں آنے دیے جاتے تھے۔

جیل میں ہر روز صبح ۱۰ بجے اجتماعی مطالعہ قرآن کی نشست ہوتی جس میں دوآنند مارگی بھی شریک ہوجاتے۔ یہ لوگ توحید کا تو اقرار کرتے مگر ان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان خود اپنی کوشش سے گیان حاصل کرسکتا ہے۔ ان کی بہت دنوں تک آر۔ایس۔ایس والوں سے نہ بنی اور انھوں نے اپنا علاحدہ میس بنالیا۔ آر۔ایس۔ایس کے لوگ بھی اپنی نشستیں کرتے تھے، ہم سے انفرادی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی جیل سپرنٹنڈنٹ کی صدارت میں مختلف موضوعات پر تقریریں بھی ہوتی تھیں۔

امیر مقامی ڈاکٹر ایس احمد صاحب طبعاً بڑے ہی نفاست پسند واقع ہوئے ہیں، وہ ہر چیز کو سلیقہ سے رکھنے اور کرنے کے قائل ہیں اور اپنے رفقا کو بھی یہی تربیت دیتے رہتے

ہیں۔ جیل میں ان کا علاحدہ کمرہ تھا۔ اُس کو انھوں نے اتنا پاکیزہ اور صاف ستھرا رکھا تھا اور ہر چیز کو ایسے قرینے سے رکھتے تھے کہ ہمارے ایک آر۔ ایس۔ ایس کے ساتھی وکیل نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہے کہ جیل میں کیسے رہا جا سکتا ہے تو اس کو ڈاکٹر ایس احمد صاحب کے کمرے کو دیکھنا چاہیے۔

ڈیڑھ ماہ بعد ہم کو ہبلی کورٹ سے سمن آیا کہ DIR کے کیس کے لیے ہم کو حاضر ہونا ہے، جس کے لیے دھارواڑ ڈسٹرکٹ جیل منتقل کر دیا گیا جو ہمارے لیے تیسری جیل تھی۔ بلاری چھوڑنے سے پہلے ہمارے آر۔ ایس۔ ایس کے ایک دوست نے میسا کے تحت ملنے والے راشن کے تعلق سے ایک گورنمنٹ آرڈر ہمارے ہاتھوں میں یہ کہہ کر دیا تھا کہ دھارواڑ جیل کا سپرنٹنڈنٹ سخت مزاج کا آدمی ہے آپ اس کو اپنے ساتھ رکھئے کام آئے گا۔ دھارواڑ جیل میں تقریباً پندرہ دن ہم کو قیدیوں کی غذا دی جاتی رہی اور جیلر کوئی نہ کوئی بہانہ بناتا رہا۔ بعد میں قانون کے مطابق ہم کو راشن دیا گیا اور یہ گورنمنٹ آرڈر ہمارے بہت کام آیا۔ جیل میں قیدیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو قانون پر عمل ہوتا ہے اگر تعداد کم ہو تو جیل کے اسٹاف کے رحم و کرم پر رہنا پڑتا ہے اور طرح طرح کی دھاندلی ہوتی ہے۔

ہبلی کورٹ کے احاطہ میں ہماری شنوائی کے دن گھر والوں سے ملاقات ہو جاتی۔ ایک مرتبہ ایک ظالم کانسٹبل ہم کو ہتھکڑی پہنانے پر مصر رہا اور کورٹ تک ہتھکڑی پہنا کر لے گیا۔ واپسی میں ہماری گفتگو سے متاثر ہو کر ہتھکڑیوں کے بغیر جیل لے گیا۔ میں نے ایس پی کے نام جیل سپرنٹنڈنٹ کے ذریعہ ایک خط لکھا کہ ہم ملک کے باعزت شہری ہیں اور سیاسی نظر بند ہیں۔

جیل کے احاطہ میں عام قیدیوں سے ملاقات ہوتی جو ہم سے محبت سے پیش آتے۔ اُن میں کچھ بے قصور بھی تھے۔ مغربی ممالک میں جس قسم کی کوشش ان کی اصلاح کے لیے کی جا رہی ہے، یہاں بھی کی جائے تو اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ہمارا مقدمہ خارج کر دیا گیا اور ہم واپس بلاری سنٹرل جیل بھیج دئے گئے۔

بلاری سنٹرل جیل منتقلی کے بعد آر۔ ایس۔ ایس کے کارکنوں اور جیل اسٹاف کے

درمیان کینٹین میں جھگڑا ہوگیا۔ بڑھتے بڑھتے بات بگڑ گئی۔ لاٹھی چارج ہوا۔ کنٹرول میں نہ آئے تو ان پر قیدیوں کو چھوڑ دیا گیا جس کی وجہ سے کئی آر۔ایس۔ایس کے ارکان زخمی ہو گئے اور انہیں جنرل ہاسپٹل بھیج دیا گیا۔ ان لوگوں نے اس کی اطلاع بنگلور اور دہلی تار کے ذریعہ بھیج دی اور بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ہم شش و پنج میں پڑ گئے کہ ہم کیا کریں۔ جیل کے اسٹاف کے ایک عہدہ دار نے خاموشی سے ہم کو اپنے گھر سے روٹیاں بھیج دیں اور مسئلہ حل ہوگیا۔ شام کے وقت GP (Prison) نے بنگلور سے آکر ان کو برت توڑنے پر آمادہ کیا اور جیل سپرنٹنڈنٹ کو معطل کر دیا گیا۔

اسٹیٹ کے میسا قیدیوں کے فیصلہ کے مطابق بلاری کے تمام میسا قیدیوں نے ہائی کورٹ بنگلور میں Habeas Corpus فائل کیا۔ آر۔ایس۔ایس والوں کا اسٹیٹ کے تمام قیدیوں سے رابطہ قائم تھا۔ چناں چہ بنگلور ہائی کورٹ کا حکم ہوا کہ ہم تمام کو ہائی کورٹ میں پیش کیا جائے لہٰذا ہمارا بڑا قافلہ بذریعہ ٹرین بنگلور سنٹرل جیل منتقل ہوا۔ یہ ہمارے لیے چوتھی جیل تھی۔ اسٹیٹ کے تمام میسا قیدی اس وقت بنگلور جمع ہو گئے تھے جن کی تعداد تقریباً ۳۵۰ تھی۔ ہائی کورٹ میں ہماری پیروی کے لیے آر۔ایس۔ایس والوں نے بہترین ایڈوکیٹ منتخب کیا تھا لیکن اس کا بھی نتیجہ نہیں نکلا۔

یہ بات ہمارے لیے قابل ذکر ہے کہ کرناٹک میں گلبرگہ جیل کے جماعت کے ارکان نے جن میں مولانا محمد سراج الحسن صاحب سابق امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا محمود خان صاحب سابق سکریٹری جماعت اسلامی ہند اور جناب محمد جعفر منیار صاحب مرحوم نے Habeas Corpus فائل نہیں کیا تھا اور DIR کیس میں بھی ضمانت پر رہائی کے لیے درخواست نہیں دی تھی۔ انھوں نے عزیمت کی راہ اختیار کی۔

ہمارے ساتھ جیل میں Coffposa کے تحت گرفتار کیے گئے قیدی بھی تھے۔ یہ قانون اسمگلروں کے لیے بنایا گیا تھا لیکن ان میں کئی قیدی ایسے بھی تھے جو اسمگلر تو نہیں تھے لیکن اسمگلروں کے ہاں کام کرنے والے ملازم تھے۔ ان کے گھر والوں کے جو خطوط آتے تھے وہ ہم سے پڑھواتے تھے۔ اس سے ان کی اصلی حقیقت و کیفیت کا اندازہ ہوتا تھا۔

بنگلور سنٹرل جیل پرانے طرز کی ہے جس میں قبروں کی طرح سیمنٹ کے کٹے بنائے گئے ہیں۔ اس جیل میں A کلاس صرف MLA's اور MP's کو دیا گیا تھا۔ باقی تمام افراد کو B کلاس دیا گیا تھا۔

A کلاس میں شری ایل کے اڈوانی، رام کرشن ہیگڑے، بہار کے شری ایس این مشرا جو جنتا گورنمنٹ میں وزیر خارجہ تھے (مولانا مودودیؒ کے انتقال کے موقع پر جماعت کے اکابرین کو لاہور جا کر نماز جنازہ میں شرکت میں مدد دی) شری دیوے گوڑا سابق وزیر اعظم، اے۔کے۔سبیا (سابق MLC) نبلکر جنا سوامی (سابق ڈپٹی اسپیکر لوک سبھا) شری مدھو دنڈوتے سابق ریلوے منسٹر وغیرہ تھے۔ B کلاس میں شری جے ایچ پاٹل سابق چیف منسٹر کرناٹک، مائکل فرنانڈیز، لارنس فرنانڈیز (دونوں جارج فرنانڈیز کے بھائی) جناب سی۔ ایم۔ ابراہیم سابق مرکزی وزیر، شری رام جوئس (سابق چیف جسٹس ہریانہ) وغیرہ تھے۔ بنگلور کے رکن جماعت جناب جنیدی صاحب جا کر ہیگڑے صاحب اور نبلکر جنا سوامی کو اردو پڑھاتے تھے۔ انھوں نے اس کے لیے مولانا افضل حسین صاحب مرحوم کی کتب کا انتخاب کیا تھا تا کہ ان حضرات کو اردو بھی سکھائی جائے اور اسلام کے متعلق بھی ان کو معلومات ہوں۔ شری ایس۔ این مشرا نے جیل میں محسن انسانیت کا مطالعہ کیا اور کہا کہ محمدؐ صاحب نے دنیا میں اتنا بڑا انقلاب برپا کیا ہے جس کا ہم کو اب تک علم نہیں تھا۔

بنگلور جیل میں آر۔ ایس۔ ایس والوں نے غالباً شیوجینتی منائی اور اس میں تقریر کرتے ہوئے کرناٹک کے ایک آر۔ ایس۔ ایس کے لیڈر مسٹر جوشی نے مسلمانوں پر شدید حملہ کیا جس پر دوسری پارٹی کے لوگوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ جماعت کے ایک رکن ڈاکٹر مقبول احمد نے صدر کی اجازت لے کر آر۔ ایس۔ ایس والوں سے اپیل کی کہ وہ اسلام سے واقفیت حاصل کریں اور قرآن مجید کا مطالعہ کریں اور کہا کہ اگر وہ قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں تو جماعت کے لوگ اس کا اہتمام کریں گے۔ چناں چہ اس طرح قرآن مجید کے مطالعہ کا سلسلہ شروع ہوا جس میں آر۔ ایس۔ ایس کے کئی افراد شریک ہوتے تھے۔

اسی طرح بنگلور سنٹرل جیل میں مختلف پارٹیوں کے لیڈر اپنی اپنی جماعتوں کا تعارف

کراتے اور اپنی پالیسی و پروگرام کے تعلق سے لکچرز دیتے تھے جس میں ہم تمام لوگ شریک ہوتے تھے۔ جماعت اسلامی ہند کا تعارف ڈاکٹر ایس احمد صاحب نے انگریزی میں کرایا۔ مقرر کے لیے صرف ایک کرسی ہوتی تھی اور سامعین نیچے شطرنجی پر بیٹھتے تھے۔ ڈاکٹر ایس احمد صاحب نے تقریر شروع کرنے سے پہلے سامعین سے مخاطب ہو کر کہا کہ اسلام نے ہم کو بڑوں کا احترام کرنے کی تعلیم دی ہے۔ میں سامعین سے کرسی پر بیٹھ کر تقریر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ بات چھوٹی سی تھی لیکن سامعین پر اس کا اچھا اثر پڑا۔ تقریر کے بعد سوالات کا موقع تھا۔ مائکل فرنانڈیز جو سوشلسٹ ہیں اور مذہب مخالف، انہوں نے کہا کہ دنیا میں جو بھی خون خرابہ ہوا ہے وہ مذہب کی وجہ سے ہوا ہے اس لیے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً صرف ایک جملہ میں ان کے سوال کا جواب دیا اور کہا کہ پچھلی دو عظیم جنگوں میں لاکھوں معصوموں کا خون مذہب کے نام پر نہیں ہوا۔ متحاربین تو سب ایک ہی مذہب عیسائیت سے تعلق رکھتے تھے، مائیکل فرنانڈیز لاجواب ہو گئے اور خاموش ہو گئے۔

لوک سبھا کا سیشن شروع ہوا تو ہمیں معلوم ہوا کہ مدھو دنڈوتے نے اسپیکر کے نام ایک لفافہ روانہ کیا مگر دہلی ایئر پورٹ پر اس کو روکنے کی کوشش کی گئی تو اس پر ایک ہنگامہ ہوا اور اسپیکر کو تار بھیجے گئے۔

ایمرجنسی سے پہلے بنگلور میں مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی گئی تھی جس کو عسکریتی تنظیم کا رنگ دے دیا گیا تھا۔ گرفتار ہونے والوں میں صدر اور سکریٹری بھی تھے۔ بنگلور جیل میں قیدیوں کے لیے مہاراجہ کے زمانہ کی تعمیر کردہ ایک مسجد ہے جس میں ہم نماز پڑھنے کے لیے جاتے تھے، مگر یہ دونوں صاحبان جیل کے احاطہ میں فلمی گانے سنتے رہتے تھے۔ اُن میں سے ایک صاحب طنزاً ہم سے کہا کرتے کہ ہم میں اور آپ لوگوں میں صرف ایک فرق ہے۔ آپ لوگ نماز پڑھتے ہیں اور ہم نماز نہیں پڑھتے! اس کا ہمیں بہت دکھ ہوتا۔ بعد میں ہمارے ساتھ ان کا تبادلہ بلگام جیل کے لیے ہو گیا۔ چند دنوں بعد یہ لوگ ہم سے بہت متاثر ہوئے اور مطالعہ قرآن و لٹریچر کی نشستوں میں شریک ہونے لگے۔

جناب عبد السلام صاحب رکن جماعت بنگلور جیل میں سخت بیمار ہوئے۔ ان کے بائیں ہاتھ میں درد تھا۔ ڈاکٹر کے مشورے پر وہ گردن میں کالر پہنتے۔ وہ کرناٹک کے قدیم اراکین میں سے تھے۔ میرا ٹرانسفر جب بلگام سنٹرل جیل ہوا تو وہ گیٹ تک آئے۔ الوداع کہا اور بلگام جیل کے تمام رفقا کو سلام بھیجا۔ چند ماہ بعد ہم کو اطلاع ملی کہ جیل ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو جگہ عطا فرمائے۔ ان کے بچے تحریک کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی نماز جنازہ جامع مسجد بنگلور میں ادا کی گئی۔ اس وقت جناب میر جعفر علی صاحب مرحوم سابق رکن جماعت اسلامی ہند نے بعد نماز جنازہ جو تقریر کی تھی اس کو لوگ ابھی تک یاد رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایمرجنسی میں ظلم کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور غیرت دلائی کہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔

آر۔ ایس۔ ایس کے لوگ تو ہماتی واقع ہوئے ہیں اس لیے وہ علم نجوم کو کالج میں Introduce کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے جیل کے ایک بھٹ نامی ساتھی کو کسی نے کہا کہ اگر وہ ہر روز علی الصبح ۱۰۰ لوٹے ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو ان کی رہائی ہو جائے گی، چناں چہ صبح تک پانی کا ٹینک خالی ہو کر رہتا اور دوسرے لوگوں کو نہانے میں تکلیف ہوتی۔ اس طرح ہر روز کوئی نہ کوئی پیشین گوئیاں رہائی کے متعلق ہوتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے کہتے کہ یہ شاعری ہے۔

بلگام سنٹرل جیل شہر سے دور ایک تاریخی جیل ہے جس میں آزادی کی جدو جہد کے دوران مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی جی کو رکھا گیا تھا۔ یہاں پر میسا اور Coffposa کے کئی قیدی تھے۔ Non-veg اور Veg کا علیحدہ میس تھا۔ ہم Non-veg میں تھے۔ جیل اسٹاف Coffposa کے قیدیوں کے درمیان کچھ گٹ بندی کی وجہ سے ہم کو جو راشن ملنا چاہئے تھا وہ نہیں مل رہا تھا، کافی تکلیف ہو رہی تھی۔ بعد میں تحقیق کی گئی تو معاملہ ٹھیک ہوا اور راشن ٹھیک سے ملنے لگا۔

اسی دوران میری فیملی ہبلی سے میسور منتقل ہوگئی اور مجھے اور میرے ساتھی محمد غوث کنگیری

صاحب کی سروس کو Terminate کردیا گیا اور Settlement کا چیک بھی ساتھ میں بھیج دیا گیا۔ دھمکی دی گئی کہ فوراً ریلوے کوارٹر خالی کردو ورنہ سخت کارروائی کی جائے گی۔ رہا ہونے کے بعد میں نے شاہ کمیشن سے شکایت کی تو ڈپارٹمنٹ سے وضاحت طلب کی گئی۔

ایک دن مجھے جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر بلایا گیا اور پوچھا گیا کہ آیا میں نے Parole کے لیے کوئی درخواست دی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو مجھے کہا گیا کہ تمہارے لیے پندرہ دن کا Parole منظور ہوکر آیا ہے۔ تم جانے کی تیاری کرو۔ یہ میرے لیے معمہ تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرے بھائی جو کانگریس کے ممبر تھے ایک درخواست چیف منسٹر شری دیوراج ارس کو دی تھی۔ دیوراج ارس میرے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ پیرول پر جیل کے باہر آیا تو میرے نسبتی برادر اور میری بیوی مجھ سے ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ میری رہائی ہوئی ہے۔ بہرحال ہم تمام ہبلی پہنچے جو بلگام اور میسور کے راستہ پر ہے۔ گھر خالی کرنے میں میں نے ان کی مدد کی اور میں میسور چلا گیا۔ یہاں پر ہر روز ایس پی آفس میں حاضری دینی پڑتی اور ہم پر کڑی نگاہ رکھی جاتی۔ میسور میں احمد شریف صاحب جو جماعت کے کارکن تھے DIR کے تحت گرفتار ہوکر ضمانت پر رہا ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات رہی اور حالات سے واقفیت حاصل کی۔ جناب سید شفیع اللہ صاحب جو بنگلور جماعت کے پرانے کارکن تھے اور دفتر کے کسی کام سے میسور میں قیام پزیر تھے ان سے ملاقات ہوئی اور حالات معلوم ہوئے۔ پندرہ دن بعد میں جیل لوٹ گیا۔

اسی دوران مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند کا ایک خط میرے نام آیا جس میں انھوں نے سب کو سلام کے بعد صبر کی تلقین کی تھی اور اپنے بیوی بچوں کی خطوط کے ذریعہ تربیت کرنے کی تاکید کی تھی۔

اسی دوران ہمارے بزرگ ساتھی جناب شیخ مرحوم جن کو بابائے جماعت کرناٹک کہا جاتا ہے ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، تو انہیں صرف نماز جنازہ وتجہیز وتکفین میں شرکت کی اجازت ملی اور وہ واپس بلگام سنٹرل جیل لوٹ گئے۔

بلگام جیل میں باقاعدہ قرآن ولٹریچر کے مطالعہ کی نشستیں ہوتی تھیں جن میں جماعت

کے افراد کے علاوہ دوسرے بھی شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر احمد صاحب نے تمام پارٹیوں کے نمائندوں کی ایک نشست بلائی جس میں طے کیا گیا کہ چند سوالات طے کر لیے جائیں اور ہر پارٹی کے نمائندے ان سوالات کے جوابات دیں، لیکن سوالات ہی کچھ ایسے تھے جن کے جوابات دینے سے دوسرے لوگ کتراتے تھے، مثلاً یہ کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں رہنمائی کے لیے وہ کیا پروگرام رکھتے ہیں؟ جماعت کی طرف سے ان سوالات کے پورے جوابات دیے گئے۔

ہر روز دوپہر میں کوئی نہ کوئی نشست کسی نہ کسی عنوان پر ہوتی یا کسی کتاب کا حاصلِ مطالعہ پیش کیا جاتا۔ ایک مرتبہ Exodus نامی کتاب کا حاصل مطالعہ آر۔ایس۔ایس کے ایک کارکن نے پیش کیا جس میں بنی اسرائیل کی مصر سے فلسطین ہجرت کے واقعہ کو غلط انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ جب ہم نے آر۔ایس۔ایس والوں سے کہا کہ قرآن مجید میں اس کا صحیح واقعہ بیان کیا گیا ہے تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اس عنوان پر ڈاکٹر صاحب کی ایک تقریر انگریزی میں ہو۔ چناں چہ ہم نے تقریر سے پہلے انہیں تفہیم القرآن میں جو نقشہ ہے وہ دیا تو انھوں نے اس کا ایک بڑا نقشہ بنایا اور ڈاکٹر صاحب نے اس پر مفصل تقریر کی۔ تقریر کے بعد ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا بات ہے کہ یہود تاریخ میں ہمیشہ دھتکارے جاتے رہے ہیں اور ہٹلر نے بھی Gas Chamber میں ان کے ہزاروں لوگوں کو ہلاک کر دیا؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ماضی میں انھوں نے کبھی کسی ملک سے وفاداری نہیں کی ہے۔

جیل میں ہم ایک دوسرے کے دکھ اور خوشی میں شریک ہوتے اور بہترین دوستانہ فضا میں ہمارا وقت گزرتا۔ ڈاکٹر صاحب کی دو بہنوں کا پاکستان میں انتقال ہو گیا جس کی خبر ان کو چھ ماہ بعد ملی کیوں کہ ان دنوں ہند و پاک کے درمیان خط و کتابت و پوسٹ کا سلسلہ بند تھا۔ آر۔ایس۔ایس والوں کو خبر ہوئی تو وہ آئے اور تعزیت کی۔ عیدین کے موقع پر ہم جیل کے ساتھیوں کو مدعو کرتے اور اس کی اہمیت بتاتے۔

اندرا گاندھی نے الیکشن کا اعلان کیا۔ الیکشن کے اعلان کے چند دنوں بعد جگجیون رام

نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا اور ایک نئی پارٹی CFD کی تشکیل کا فیصلہ کیا۔ یہ خبر سنی گئی تو پوری جیل نعروں سے گونج اٹھی اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے سیاسی قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

ایمرجنسی کے دوران جے پرکاش نارائن اور مرارجی ڈیسائی کو تقریباً ۲۲ ماہ نظر بند رکھا گیا تھا۔ رہائی کے بعد مرارجی ڈیسائی کا ایک آرٹیکل Illustrated Weekly میں شائع ہوا۔ جیل میں پڑھنے کا مجھے موقع ملا۔ اس پورے آرٹیکل میں عقیدہ توحید کی جھلک نظر آرہی تھی۔ انسان جب تمام سہارے کھو دیتا ہے تو اسے خدا کا سہارا ہی نظر آتا ہے اور یہ چیز اس کو عقیدہ توحید پر سوچنے پر متوجہ کرتی ہے۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں پارلیمنٹ کا الیکشن ہوا اور نتائج سامنے آنے لگے۔ صبح کی نماز کے بعد خبر ملی سنجے گاندھی ہار گئے۔ بعد میں اطلاع ملی کہ اندرا گاندھی بھی ہار گئیں۔

اب قید و بند کا یہ ڈرامہ ختم ہونے والا تھا۔ اب رہائی کے لیے چند دن باقی رہ گئے تھے۔ بالآخر مارچ کے آخری ہفتہ میں ہماری رہائی ہوئی۔ جیل کے باہر تمام پارٹیوں کے کارکن نعرہ لگاتے ہوئے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ بلگام شہر میں ہمارا جلوس نکالا گیا۔ خواتین آرتی لیے ہوئے استقبال کر رہی تھیں، عوام کا جوش وخروش اتنا تھا کہ ہم ان کے ہاتھوں بے بس تھے۔ وہاں سے ہبلی کے لیے ہماری روانگی ہوئی۔ ہبلی سے باہر رفقا نے ہمارا استقبال کیا اور میں دوسرے دن میسور لوٹ آیا جہاں پر میری فیملی تھی۔

اس طرح ۲۲ ماہ کا ایک آزمائشی دور ختم ہوا۔ خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں بقدر استطاعت ہی ڈالتا ہے لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا۔ خدا تعالیٰ کا ہم پر بڑا احسان رہا۔ چار ماہ بعد ہم کو پھر سے ڈیوٹی پر لے لیا گیا اور یوں گویا ۲۲ ماہ کو ڈیوٹی تصور کر کے Arrears دیے گئے۔ دُعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارے اس حقیر عمل کو قبول فرمائے اور بقیہ زندگی اس کے دین کی سربلندی کے لیے جدو جہد کی صورت میں دنیا سے اٹھائے، اور آخرت میں بھی اس کی رضا حاصل ہو سکے۔

❀❀

طرزِ عمل کی خوشبو بکھری

❑ ڈاکٹر ایس احمد
ہبلی (کرناٹک)

میری گرفتاری کا آغاز پونہ میں ہوا جب کہ میں عیادت کے لیے وہاں گیا تھا۔ رات کو ہی DD کی خبروں سے معلوم ہو چکا تھا کہ ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد بشمول جماعت اسلامی ہند کے بہت سی تنظیموں پر پابندی عاید کی گئی ہے اور ان کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے۔ گرفتاری غیر متوقع نہیں تھی اور کچھ پریشانی بھی نہیں تھی کیوں کہ ۱۹۶۵ء میں ہندو پاک کی جنگ کے دوران ۶ مہینے جیل میں گزار چکا تھا۔ تعجب یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح پولیس انسپکٹر اور ایک کانسٹبل پونہ میں گھر پر پہنچ گئے۔ دوسرے دن ہبلی کے لیے روانگی ہوئی۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے ہبلی کی جیل بھیج دیا گیا۔ یہاں پہلے ہی دو ارکان موجود تھے۔ ہم سب DIR میں گرفتار کیے گئے تھے۔ آخری ایام میں محسوس ہوا کہ جیل میں پہلے کافی شور وغوغا اور بعض وقت بدکلامی ہوتی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہماری نمازوں، گفت ونشست اور برتاؤ نے قیدیوں پر اچھا اثر ڈالا۔ چار چھ مہینوں میں ہماری رہائی ہوئی۔ حکومت اور اس کی انتظامیہ کا رویہ مضحکہ خیز رہا۔ سنیچر کے شام رہائی ہوئی۔ پیر کے دن صبح ہی میری اہلیہ کے ساتھ اپنی زیر سایہ بچی کو لے کر پونہ کے لیے اپنی کار میں نکلا۔ دس میل کے فاصلے پر دھارواڑ کے قریب پٹرول لینے کے لیے رکا۔ چیکنگ DSP نے میری کار کے سامنے اپنی گاڑی کھڑی کر دی اور اتر کر مجھ سے اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا اور بتایا کہ مجھ سے میرا بیان لینا ہے، میں سمجھ گیا۔ اس کے آفس پہنچنے کے کافی دیر بعد کہا گیا کہ مجھے میسا میں گرفتار کیا

گیا ہے۔ میں نے نیچے پہنچ کر اپنی اہلیہ کو اطلاع دے دی کہ وہ ہبلی واپس چلی جائیں مجھے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ شام کے وقت ہبلی پہنچا۔ ہبلی پولیس اسٹیشن میں شیخ صاحب کو موجود پایا۔ ہم دونوں کو راتوں رات بلاری جیل بھجوادیا گیا۔ اگلے دن اور دو رفقا جیل بھیجے گئے۔ اس طرح ہم چار اور قریب قریب دوسرے ۲۰۰۔۱۵۰ سب میسا کے گرفتار شدگان — جن سنگھی، آر۔ایس۔ایس، آنند مارگی، نکسلائٹ، سوشلسٹ، کمیونسٹ، مسلم لیگی اور جے پرکاش نارائن کی نئی پارٹی کے ممبران — ایسے مختلف افراد کا ایک جمگھٹا تھا۔ دو بیرکوں کے درمیان جہاں خاصا کھلا میدان تھا ہم سب مل بیٹھ کر تفریح کرتے تھے۔ ایک روز ڈاکٹر الوا سابق وزیر صحت کرناٹک جو کچھ حد تک مجھ سے واقف تھے ان سے میں نے ذکر کیا کہ کیوں نہ مختلف تنظیموں کے بارے میں جو آج اتفاق سے یہاں موجود ہیں ہم معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں، انھوں نے اتفاق کیا۔ تنظیموں کے ذمہ داران کو اس کے لیے آمادہ کیا گیا گو جن سنگھ اور آر۔ایس۔ایس کے لوگ ابتداء اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک شام اس کے لیے طے ہوئی اور مجھ سے اس کی ابتدا کرنے کے لیے کہا گیا۔ میں نے کہا کہ کسی بھی تنظیم کو سمجھنے کے لیے پانچ باتوں کا جاننا ضروری ہے (۱) اس کا مقصد (Goal) (۲) اس کے لیے وہ کس نظریے کی پیروی کرتی ہے (Source of inspiration) (۳) اس کا طریق کار (Method of Propogation) (۴) تنظیم کی صورت (Organisational Setup) متعلقہ وسائل و ذرائع (Source of Income) یہ تمام باتیں انگریزی میں ہوئیں۔ ڈاکٹر الوا کو تجویز پسند آئی۔ انھوں نے سبھوں کو پابند کیا کہ ان پانچ نکات پر اپنا منشا پیش کریں۔ اظہارِ خیال کرتے ہوئے میں نے کہا: (۱) ہمارا مقصد پوری انسانیت کی بھلائی ہے۔ ہم سب انسانوں، اولادِ آدم کو بھائی بھائی سمجھتے ہیں (۲) اس کے لیے ہم رہنمائی قرآن اور پیغمبر کی زندگی سے لیتے ہیں (۳) ہمارا طریقہ کار یہ ہے کہ ہم نہایت خوش دلی سے میٹھے بول لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، اگر کچھ شکوک ہوں تو ان کی وضاحت کرتے ہیں اور فیصلہ ان کی پسند پر چھوڑ دیتے ہیں، اور جو خدمت مطلوب ہوتی ہے اسے انجام دینے کی پوری کوشش کرتے ہیں (۴) تنظیم کا ڈھانچہ یہ ہے کہ دہلی میں ہمارا

مرکز ہے جہاں ہمارا امیر (President) رہتا ہے، ان کی ایک Working Committee ہے ان کو چار سال کے لیے چنا جاتا ہے (۵) ممبران کے چندے، زکوٰۃ اور Publishing House کی آمدنی ذرائع آمدنی ہیں۔ اپنے تنظیمی مقاصد کے لیے عام چندہ نہیں کیا جاتا، اعانتیں افرادِ جماعت ہی سے حاصل کی جاتی ہیں۔ لوگوں نے سن کر اچھا اثر قبول کیا خاص کر ڈاکٹر الوانے۔

جب ہم بلاری سے بنگلور منتقل ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے اس کا ذکر A Class کے نظر بندوں سے کیا جہاں سب لیڈر موجود تھے۔ ان میں سے چند کے نام جو یاد رہ گئے ہیں درج ذیل ہیں:

1)S.N. Mishra : Planning Commission Chairman, 2) Madhu Dandavate 3) L.K.Advani 4) R.K. Hegde 5) H.J. Patel ex-Chief Minister, Karnataka 6) H.D. Deve Gowda, ex-Prime Minister, 7) Shinde 8) C.M. Ibrahim 9) Dr. Achar, R.S.S. 10) Alva, (Syndicate) and Michael Fernandes

ان لوگوں کے اصرار پر خاص کر ڈاکٹر الوا کے کہنے پر میں نے جو بھی باتیں بلاری میں پیش کی تھیں ان لیڈروں کو سنانے کے لیے کہا گیا۔ میں نے وہ باتیں ان کے سامنے رکھیں اور جب وضاحت کے لیے سوالات کرنے کو کہا گیا تو دو سوالات کیے گئے (۱) اڈوانی صاحب نے کہا کہ آپ ایک مسلم ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں ہم ایک آسمانی ہدایت کے تحت اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں وہ آپ بھی کر سکتے ہیں اگر آپ اس نظریے سے اتفاق کریں (۲) دوسرا ایک سوال ایک دوسرے نے کیا کہ آپ کمیونل (Communal) ہیں۔ میرے جواب دینے سے پہلے ڈنڈوتے صاحب نے کہا کہ وہ آپ سے زیادہ سیکولر (Secular) ہیں۔

ہم چار افراد بلاری سے آئے تھے، بنگلور جیل میں پہلے سے ہی آٹھ افراد تھے جو جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے کل بارہ افراد تھے دوسرے Coffposa اور Long Term Inmates تھے۔

سب مل کر ۵۰۔۶۰ ہو جاتے تھے۔ ہماری نمازوں کی پابندی، مسجد میں درس قرآن (بنگلور جیل میں مسجد بھی ہے) جس میں دوسرے گاہے بگاہے شامل ہوتے تھے، کی بنا پر فضا بہت ہی ساز گار ہو گئی تھی۔ آر۔ ایس۔ ایس کی مختلف نشستوں میں ہم ان کی دعوت پر حصہ لیتے رہے۔ میں نے آٹھ دس مرتبہ خطاب کیا اور ان کے سوالات کا جواب بھی دیا۔ اس طرح تعلقات بہت بہتر ہو گئے۔ رہائی کے بعد بھی جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کی نشستوں میں ہم ان کی دعوت پر حصہ لیتے رہے۔ جیل میں کوئی شکایت نہیں تھی۔ کھانے کا اچھا انتظام تھا۔ کسی قسم کی بے جا تنگی نہیں کی جاتی تھی۔ ہمارے ایک رفیق نے ایک مسلمان نوجوان کو قرآن پڑھنا سکھایا اور نمازوں کا پابند بنایا یہاں تک کہ رہائی کے بعد ہمارے رفیق سے پھر رابطہ قائم کیا (اس کی رہائی ہمارے بعد ہوئی) اور ان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ کافی خوشحال نوجوان تھے۔ دوسرے ایک مارواڑی فرد کو جو Coffposa کے تحت گرفتار ہوا تھا اسے اردو پڑھنا سکھایا یہاں تک کہ وہ ماہنامہ الحسنات کا خریدار بن گیا۔

کٹھن گھاٹیوں کا سفر

❑ سعید احمد
بلگام (کرناٹک)

۳ر جولائی ۱۹۷۵ء بروز جمعرات مغرب کی نماز کے بعد میں، برادر گلمست اور جاوید اختر برادر لیاقت ملا کی جوتے کی دوکان میں بیٹھے ملک کے حالات پر گفتگو کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں قید و بند کا ذکر بھی آیا اور بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا کہ ایک مرتبہ جیل جانے سے اپنے ایمان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ میری اس بات کی سب نے تائید کی اور شاید موجود رفقا میں میرے حق میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ ٹھیک نو گھنٹے بعد میں آزاد دنیا سے ایک انجانی اور محدود دنیا میں منتقل ہو رہا تھا۔

صبح کا وقت تھا، میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا کہ ابا جان کو باہر کسی سے باتیں کرتے سنا۔ سب سے پہلے میرا گمان اپنی گرفتاری کی طرف گیا۔ جیسے ہی کمرے سے باہر آیا میرے سامنے لمبا جبا پہنے کوئی صاحب کھڑے تھے۔ ابھی اندھیرا ہی تھا اور میں پہچان نہیں سکا کہ میرا مخاطب کون ہے۔ ابا مجھے جگا کر مسجد چلے گئے تھے، انھوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ یہ میرے کوئی دوست ہیں اور باہر سے آئے ہیں۔ میرے مخاطب نے میرا نام پوچھا اور نام بتانے پر کہا کہ ذرا باہر آیئے۔ اب تک میں اپنے مخاطب کو پہچان نہیں سکا تھا، باہر آنے پر میری نظر جب اس کے دوسرے ساتھیوں پر پڑی تو یہ صاف ہو گیا کہ میں سرکاری مہمان بن رہا ہوں۔ میں ان کے ہمراہ ہو لیا۔ میرے مکان سے کچھ دور ہی پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ قریب پہنچا تو اندر سے آواز آئی السلام علیکم۔ یہ امیر مقامی تھے، پہلے ہی ان کا استقبال ہو چکا تھا۔

پوچھا گیا محمد یوسف عطار کا مکان کہاں ہے؟ پہلے تو ہم نے نشاندہی کر دی، پھر ان کی درخواست پر میں نے موصوف کے گھر تک رہبری کی۔ یوسف صاحب کو آواز دینے کے لیے بھی مجھ سے ہی کہا گیا۔

پانچ بجکر بیس منٹ پر ہم تینوں رفیق پولیس اسٹیشن میں تھے۔ پندرہ بیس منٹ انتظار کے بعد ہم نے کہا کہ ہمیں نماز پڑھنا ہے وضو کے لیے پانی چاہیے۔ معلوم ہوا کہ پانی نہیں ہے۔ ہم نے تیمم کیا اور ایک لکڑی کے تختے پر نماز پڑھی۔ تقریباً ساڑھے چھ بجے کاغذی کارروائی شروع ہوئی اور اس عرصے میں ہماری چائے سے تواضع کی گئی۔ پھر ہر ایک کا نام، گھر کا پتہ، گھر کے افراد کے نام، رشتہ داروں کے نام اور پتے، جسم کے ناپ تول، جسم پر کٹے کے نشانات وغیرہ نوٹ کیے گئے، بہرحال کچھ دیر تک کاغذی کارروائی چلتی رہی۔ جماعت کے آفس سے متعلق پوچھا گیا تو ہم نے کہا کہ جماعت کا کوئی آفس نہیں ہے۔ خطوط وغیرہ گھر کے پتہ پر ہی آتے ہیں۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے مجھے دوبارہ گھر لایا گیا تاکہ وہ خطوط حاصل کیے جائیں۔ واپس گھر آکر یہ دیکھ کر خوشی اور اطمینان ہوا کہ گھر کے کسی فرد میں بفضل تعالیٰ کسی قسم کی بے چینی یا رنج وغم کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔ خطوط کی فائل میں نے دی۔ مزید پوچھ تاچھ ہوئی، میں نے پارۂ عم کا ایک نسخہ لیا اور گھر والوں سے بس اتنا کہا کہ میں جارہا ہوں، آپ لوگ بے فکر رہیں۔ جب گھر سے باہر آئے تو راستہ کے دونوں طرف کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جو کاغذی خانہ پوری پولیس نے کی تھی اس پر ہمارے کرائے دار کے دستخط لیے اور دوبارہ پولیس اسٹیشن چل پڑے۔ جماعت سے متعلق پوچھا گیا تو ہم نے مختصراً تعارف کرایا۔ اب جناب کینگری صاحب کو ان کے مکان لے جایا گیا تو میں نے موصوف سے کہا کہ میری کتابوں کی الماری میں جماعت کا تعارفی لٹریچر اور دستور کی کاپی ہے لیتے آئیں۔ (واضح رہے کہ ہم تینوں کے مکانات قریب قریب ہی ہیں) دستور جماعت اور جماعت اسلامی کے تعارفی کتابچے PSI کو دیے گئے۔ آخر میں یوسف صاحب کو لے جایا گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے کھانا ملا۔ تقریباً دو بجے دوپہر پولیس جیپ میں ہمیں کورٹ لایا گیا۔ پاس ہی ایک اور جیپ آکر کھڑی ہوگئی جس میں .R.S.S کے افراد تھے۔ مجسٹریٹ

کے سامنے پیش کیا گیا۔ بغیر کسی پوچھ تاچھ کے ہمارے کاغذات پر ۱۱ر جولائی کی تاریخ درج کر کے پولیس کو واپس کر دیا گیا۔ میں تو خاک بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہاں کیا آنکھ مچولی ہوئی۔ کچھ دیر بعد ہنڈ مہ گا جیل کے لیے روانگی ہوئی۔ دس پندرہ منٹ میں ہم لوگ سنٹرل جیل پہنچ گئے۔ اس عرصے میں جیپ میں لگا ہوا وائرلیس برابر چلتا رہا۔ جیل سے باہر جیپ روک کر پولیس آفیسر نے کہا کہ آپ لوگ اپنے گھر والوں کے لیے کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں تو لکھ کر دے دیں میں خود انہیں پہنچا دوں گا۔ میں نے اور کینگری صاحب نے مختصراً اپنی خیریت لکھ کر انہیں دے دی۔ جیل کے آفس میں R.S.S. کے افراد سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔

۱۔ شری پانڈورنگ نکھارگے۔ ان کی الکٹرک پارٹس کی دکان ہے عمر تقریباً بیالیس سال۔

۲۔ شری گنپت راؤ کلکرنی۔ یہ کرلوسکر انجن کے ایجنٹ ہیں عمر تقریباً پینتالیس سال۔

۳۔ شری رام بھاؤ کلید۔ یہ ملازمت کرتے ہیں۔ عمر تقریباً انتالیس سال۔

۴۔ شری بال کرشن۔ انجینئر ہیں عمر تقریباً بتیس سال۔

اب طبیعت میں ایک طرح کا سکون واطمینان تھا۔ تینوں ساتھیوں نے پہلے ظہر پھر باجماعت نماز عصر ادا کر کے اطمینان سے اپنے اپنے بستر لگا کر کمر سیدھی کرنے کے لیے دراز ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جیل کا کھانا آیا۔ مغرب کے فوراً بعد ہم اور آر۔ ایس۔ ایس کے لوگ کھانے کے لیے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ہندو مسلم کا کوئی تفرقہ نہ رہا۔ R.S.S. اور جماعت اسلامی کے افراد ایک دوسرے کو سمجھ رہے تھے، پرکھ رہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد دل ملتے چلے گئے۔

الحمدللہ معمول یہ تھا کہ صبح چار بجے جاگنے لگے، نوافل کے بعد نمازِ فجر باجماعت پڑھی جانے لگی پھر مطالعہ قرآن۔ ہمارے پاس صرف ''پارہ عم'' اور ''انتخاب حدیث'' ابھی دو ہی کتابیں تھیں۔ شروع میں ہم تینوں اسی سے استفادہ کرتے رہے۔

چائے سے فارغ ہوتے ہی ہمارے دوسرے غیر مسلم ساتھی اپنی عبادت جسے یہ لوگ

''سوریہ پرارتھنا'' کہتے تھے شروع کرتے۔ ہفتہ عشرہ درس قرآن برادرم کنگیری صاحب دیتے رہے، کچھ دنوں بعد یہ سلسلہ بند ہوا اور انفرادی مطالعہ ہی چلتا رہا۔ گیارہ بجے ہم سب مل کر کھانا کھاتے۔ کچھ دیر چہل قدمی ہوتی پھر دو بجے تک آرام۔ دو بجے ظہر پڑھتے۔ تین بجے چائے آتی یا ہم خود منگوا لیتے۔ کچھ دنوں کے بعد برادرم یوسف صاحب کے گھر سے چائے آنے لگی تو جیل کی چائے بند کر دی گئی۔ اس کے بعد عصر تک مطالعہ کیا جاتا۔ نماز عصر کے بعد اپنے کمپاؤنڈ میں چہل قدمی ہوتی۔ کمپاؤنڈ کافی لمبا چوڑا تھا۔ جو چھ بجے بند کر دیا جاتا۔ مغرب تک مطالعہ، کچھ گپ شپ یا اخبارات کا مطالعہ جو صرف کنڑ اور مرہٹی میں ہوتے۔ مغرب کے بعد ہندو مسلم عبادات کا منظر پورے ہال کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ ہال کے ایک سرے پر کلام رب کی آیات بلند ہوتیں تو دوسرے سرے پر سنسکرت کے اشلوک کی گونج۔ ہم تو دس پندرہ منٹ میں ہی اپنی عبادت مکمل کر لیتے، لیکن سنسکرت کے اشلوک کے ساتھ تالیوں کی گونج میں مختلف قسم کے بھجنوں کا سلسلہ تقریباً رات ساڑھے آٹھ بجے تک جیل کی خاموش فضا میں چلتا رہتا۔ ساڑھے آٹھ بجے دسترخوان لگتا۔ ہمارے قافلۂ حق کے جو ساتھی زنداں سے باہر تھے ان کے متعلق معلوم ہوتا رہا کہ نام نہاد آزاد فضا میں جی رہے ہیں۔ خوف و دہشت اور مصائب کے گرد و غبار میں اپنے نصب العین پر نظریں جمائے ہیں۔ ان کے لیے ثبات، حوصلوں میں بلندی، خدا ترسی اور ان کی تحریک سے وابستگی کے لیے بے اختیار دل سے دعائیں نکلتیں۔ اپنے مالک کے حضور اپنے اعمال کی کوتاہی یاد آتی تو دل امنڈ آتا اور آنکھیں چھلکنے لگتی۔ یہ خیال بھی آتا کہ جب ہم اس دارِ فانی سے اٹھ جائیں گے اور عمل کے دروازے بند ہو جائیں گے تو پیچھے رہ جانے والے ساتھی ہمارے لیے بھی کلمۂ خیر کہیں گے۔ پھانسی گیٹ پر ٹنگے ہوئے ہک کو دیکھ کر جو ہمارے کمرے کی کھڑکیوں سے صاف نظر آتے یہ احساس شدت سے جاگ اٹھتا کہ آگے چلے جانے والے ساتھیوں کے لیے بلاشبہ نہایت قیمتی ہدیہ ہے۔

یہ بھی دیکھا جاتا کہ ہمارے ہال کے آگے اور پیچھے درختوں پر بسیرا کیے پرندوں کی چہچہاہٹ اور پروازیں ان کی آزادانہ زندگی پر گواہ ہیں، ان کے درمیان کوئی اونچ نیچ اور

چھوت چھات بھی نہیں ہے، ان کی قوم انہیں کبھی قید نہیں کرتی اور حضرت انسان جو آزاد پیدا ہوا ہے اس کی آزادی پر اسی جیسے انسان پابندی لگاتے ہیں۔ خیالات وافکار کے پر کتر کے اسے قید و بند کی چہار دیواری میں محبوس کر دیتے ہیں اور اپنے درمیان اونچ نیچ کی لعنتوں کو بھی ہوا دیتے ہیں۔ کبھی کبھار تو خاص کر دوپہر کے سناٹے میں ایک آدھ چڑیوں کا جوڑا کھلی کھڑکیوں سے اندر آجاتا اور جھوٹے برتنوں سے اپنی چھوٹی سی چونچوں کے ذریعے اپنا حصہ لے اڑتا۔ بعض اوقات اس قدر قریب آجاتا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسے ذرا بھی تکلف نہیں ہے۔ ان کا بے خطر ہمارے قریب تر ہونا بھی سبق آموز تھا۔ اللہ مالک الملک ہے، اسی پر ساری تمناؤں، توقعات اور کوششوں کا مدار ہے، وہی کمزوروں کا سہارا اور غیب سے مدد دینے والا ہے۔

خیال سود نہ اندیشۂ زیاں ہے ابھی
چلے چلو کہ مذاقِ سفر جواں ہے ابھی

اس طرح دن پر دن گزرتے رہے۔ دو مرتبہ گھر والوں سے ملاقات بھی ہوئی اور عدالت کے چکر بھی لگائے گئے۔ دوسرے ہفتہ ہی سے ہمارے دو گروپ بن گئے تھے اس لیے کہ ہمارے زنداں کے ساتھیوں اور ہماری کورٹ کی تاریخوں میں کچھ فرق ہو گیا تھا ہماری پیشی کی تاریخیں آگے پیچھے پڑتی تھیں۔ خوشی اس بات کی رہتی تھی کہ عدالت میں آنے پر رفقا سے ملاقات اور ملک کے حالات اور قافلۂ حق کے دوسرے ساتھیوں کے متعلق واقفیت حاصل ہو جاتی تھی۔

پندرہ دن بعد ہماری تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور ہم سات سے سترہ ہو گئے۔ ان نئے آنے والوں میں نوجوان اور ادھیڑ عمر والے بھی تھے، R.S.S. اور جن سنگھ سے تعلق رکھنے والے، سرودیہ پارٹی والے اور مزدور یونین کے ادھیکشک بھی۔ جنگ آزادی کے ایک بزرگ شری انوگر وجی بھی تھے جو زندگی کی ستر بہاریں دیکھ چکے تھے اور اب بھی صحت مند و توانا تھے۔ سرودیہ پارٹی سے تعلق رکھنے والی ایک نوجوان لڑکی بھی تھی جو اپنے باپ کے ساتھ گرفتار ہو کر آئی تھی اور زنانہ جیل کے حصہ میں رکھی گئی تھی۔ یہ سبھی حضرات حکومت کے

خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے آپ کو گرفتار کرا رہے تھے۔

پھر ایک شام اچانک ہمیں حکم ملا کہ ہمیں یہ ہال خالی کرنا ہے کیوں کہ یہاں میسا میں گرفتار دوسرے افراد کو رکھا جائے گا جو بنگلور سے یہاں لائے جا رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا سارا سامان دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ اگلے دن ہمارے اس عارضی کنبہ میں ایک اور شخص کا اضافہ ہوا۔ یہ صاحب مزدور یونین کے وکیل تھے، اس طرح ہماری ٹیم میں دو وکیل بھی شامل ہو گئے۔

ہماری گرفتاری کے دو چار دن بعد ہی ایک مسلم وکیل جناب انور چانشاہ والے خود ہی جیل آئے تھے، ہماری طرف سے کیس کی پیروی کرنے کی پیش کش کی اور ہمارے دستخط لے کر پیروی شروع بھی کر دی تھی اور ہماری ضمانت کے لیے درخواست دی تھی، مگر درخواست خارج کر دی گئی۔ پھر ہمارے اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے وکلا نے مل کر ڈسٹرکٹ کورٹ میں درخواست دی لیکن وہاں سے بھی ضمانت کی درخواست کو خارج کر دیا گیا اور ہم لوگ اللہ ہی سے استقامت کی دعا کرتے رہے۔ البتہ ڈسٹرکٹ جج نے پولیس کو وارننگ دی کہ اگست کے آخر تک اگر ہم لوگوں پر لگائے گئے الزامات کی چارج شیٹ داخل نہیں کی تو ان لوگوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ (اب تک ہم پر چارج شیٹ نہیں لگائی گئی تھی) اس عرصے میں ہماری تعداد گھٹنے لگی۔ جو لوگ ایمرجنسی کے خلاف ستیہ گرہ کر کے آئے تھے انہیں ایک ہفتہ سے چھ ہفتہ تک کی سزا سنائی گئی تھی اور وہ اپنی اپنی میعاد پوری کر کے رہا ہو رہے تھے۔

ہمارے عدالت کے چکر ہفتہ عشرہ بعد برابر چلتے رہے۔ آخر کار پولیس نے ہمارے خلاف چارج شیٹ داخل کر دی اور ہمارے وکیل کی معرفت اس کی ایک ایک کاپی ہمیں موصول ہوئی۔ گرفتاری کے چوتھے دن ۷ر جولائی کو اخبار کے ذریعے ہمیں جیل میں معلوم ہوا کہ فلاں فلاں جماعتوں پر پابندی عاید کی گئی ہے۔

دو تین دن بعد ہماری پیشی ہوئی۔ جج نے سوال کیا کہ آپ لوگوں پر یہ اور یہ الزامات ہیں، کیا آپ اس کا اقرار کرتے ہیں؟ ہم نے انکار میں جواب دیا۔ اگر ہم قبول کر لیتے تو فوراً رہا کر دیے جاتے کیوں کہ ہم پر جو الزامات لگائے گئے تھے ان کی سزا چھ ہفتوں سے

زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ چوں کہ ہم نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی تھی بلکہ جماعت پر پابندی لگنے کے اعلان سے پہلے ہی گرفتار کر لیے گئے تھے، ہمیں میٹنگ کا موقع ہی نہیں تھا۔ پھر جماعت کی تیس پینتیس سالہ تاریخ گواہ ہے کہ جماعت نے قانون کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، ہمارا کوئی کام زیر زمین نہیں ہوتا، جماعت کا سارا لٹریچر سارے ملک میں اور ملک کی ہر زبان میں کھلے بازار میں فروخت ہوتا ہے۔ ہم جو کام بھی کرتے ہیں ملک کے قانون اور دستور کے حدود کے اندر رہ کر کرتے ہیں۔ بہر حال ہم نے انکار کیا اور جج نے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے دی۔ ہم اطمینان کے ساتھ واپس آ گئے، ان پندرہ دنوں کے اندر ہی ماہ رمضان شروع ہونے والا تھا۔

سچ کہا تھا صاحب تفہیم القرآن نے ''ہم نے جس راستے کو اپنایا ہے یہ راستہ بڑی کٹھن گھاٹیوں سے ہو کر گزرتا ہے۔'' پہلے ہی دن سے یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے اور اپنے مالک سے مکمل توفیق وتوکل کی دعا کے ساتھ ہم اس راستے پر چلے، اس لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اللہ ہی ہے جو مالک الملک ہے اور اسی پر اپنی ساری آرزوؤں، تمناؤں، توقعات اور کوششوں کا مدار ہے۔ وہی کمزوروں کا سہارا اور غیب سے مدد کرنے والا ہے۔

دو مہینے سے زائد عرصہ ہمیں جیل میں گزر گیا، لیکن کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ باہر سے تحفے نہ آتے ہوں اور وہ بھی ان انجانے لوگوں کے ذریعے جن سے ہم واقف تک نہیں تھے۔ اللہ کا وہ فرمان کہ ہم اپنے بندوں کو ایسی جگہ سے رزق دیتے ہیں جہاں ان کا تصور تک نہیں جاتا بالکل سچ ثابت ہو رہا تھا۔ بعض اوقات تو سولہ سولہ نمونے کے کھانے دسترخوان پر پھیلے رہتے تھے جو اللہ کے اس فرمان کا جیتا جاگتا مشاہدہ تھا۔

ہمارے ساتھیوں کی دو دن مسلسل پیشی ہوئی مگر بے نتیجہ رہی۔ تیسرے دن اس توقع کے ساتھ ہمارے ساتھی کورٹ جا رہے تھے کہ آج رہائی ہو جائے گی۔ اسی خیال سے اپنا سارا سامان باندھ کر ایک جگہ رکھتے چلے گئے، لیکن رہائی نہیں ہوئی۔ معلوم ہوا کہ جج صاحب کی ترقی ہوئی تھی جس کی خوشی میں ایک تقریب منعقد کی گئی تھی اس لیے وہ نہیں آئے۔

ماہ صیام کی آمد آمد تھی۔ ہم نے جیلر سے معلوم کیا کہ چاند کے نظر آنے نہ آنے کی اطلاع ہمیں کیسے ہوگی؟ بتایا گیا باہر سے یہاں فون پر اطلاع دی جاتی ہے اور جیل کے مسلمان قیدی روزوں کا اہتمام کرتے ہیں اور ان کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں پچاس ساٹھ مسلمان قیدی ہیں اور بیشتر نے روزے رکھنے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ انہیں نئے بستر، چادر وغیرہ دئے گئے اور ان تمام لوگوں کو ایک ہی مقام پر رکھا گیا۔ سحری کے انتظام کے لیے ہم نے جیلر کو اپنا پیغام پہنچایا تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ چاند ہونے کی صورت میں سحری کا انتظام بھی ہوگا اور چاند کی اطلاع بھی دیں گے، چناں چہ شب میں دو بجے اطلاع ملی کہ چاند ہوگیا ہے۔ یہ اطلاع ہمارے پہرے دار نے جگا کر ہمیں دی۔ پھر حسب معمول چار بجے جاگے اور نوافل ادا کر رہے تھے کہ جیل کا کھانا آگیا۔ حسب خواہش لوگوں نے سحری کی۔

ہمارے ساتھیوں کی آج پھر پیشی تھی، صبح ساڑھے نو بجے یہ لوگ کورٹ گئے۔ ان کے ساتھ مزدور یونین کے وکیل رام آپٹے بھی گئے، ان کی بھی آج پیشی تھی۔ شام کو رام آپٹے صاحب اکیلے ہی واپس آئے اور خوش خبری سنائی کہ وہ سب رہا ہو گئے۔ اس سے یہ اطمینان ہوا کہ اگر اللہ نے چاہا تو دو چار روز میں ہم بھی رہا ہو جائیں گے۔ اب تو ہم اُس حقیقی عادل ہی سے خیر کے لیے بدست دعا تھے۔

پندرہ دن بعد ہم کورٹ پہنچے۔ ہمارا پہلا گواہ ''مشتاق احمد'' نامی شخص تھا، سرکاری وکیل نے اس سے سوالات کیے اور اس نے ہر سوال کا جواب نفی میں دیا۔ دوسرے گواہ بھی مسلمان ہی تھے ''نبی صاحب'' یہ حضرت بھی مکر گئے اور کسی بات کا جواب تشفی بخش نہیں دیا۔ سرکاری وکیل نے باقی گواہ دوسرے دن پیش کرنے کے لیے جج صاحب سے درخواست کی حالانکہ باقی گواہ بھی موجود تھے۔ ہم شام تک کورٹ ہی میں رہے اور اس عرصے میں رفقا، دوست، احباب اور عزیزوں سے خوب خوب ملاقاتیں ہوئیں اور ہم شام ساڑھے پانچ بجے اپنے مستقر پر واپس پہنچے۔

۱۱ ستمبر جمعرات کے دن تو عدالت میں کافی بھیڑ تھی، بہت زیادہ لوگ اپنے اور غیر

موجود تھے۔ اس دن ان لوگوں کے چہرے بھی دیکھنے کو ملے جو اب تک ایمرجنسی کے خوف سے ہم سے دور دور تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اور مل کر خوشی ہوئی، خصوصاً بڑے بھیا سے مل کر، پورے سوا دو مہینے بعد بھائی جان سے ملاقات ہوئی تھی، لیکن کوئی بات نہیں ہو سکی۔ دوسرے دن مزید تین گواہوں اور ایک پولیس کانسٹبل کا بیان سنا گیا۔ اب تک جس قدر گواہی پولیس کے گواہوں نے دی تھی اس میں کسی نے جھوٹ نہیں بولا تھا، لیکن پولیس کانسٹبل کا بیان سن کر افسوس اور دکھ ہوا۔ جو افراد عوام کے محافظ اور قانون کے نگہبان ہوتے ہیں وہی قانون کی دھجیاں اڑانے والے اور عوام پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں۔ پولیس ڈپارٹمنٹ اس پہلو سے عام شہریوں کی نظر میں بدنام ہے یہ ملک عزیز کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ جب کوئی جوان اپنے جسم پر پہلی مرتبہ خاکی وردی ڈالتا ہے تو شاید اپنے ضمیر، دین وایمان سب سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔

افسوس اس بات پر ہوا کہ اس نوجوان پولیس کانسٹبل کی میں نے بہت تعریف سنی تھی کہ یہ دیندار ہے، نمازی ہے اور تبلیغی جماعت میں کام بھی کر چکا ہے۔ یہ نوجوان اس بات کا اقرار کرنے کے باوجود کہ میں اللہ کو حاضر وناظر جان کر جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا نیز اس کے باوجود کہ وہ خود روزہ سے تھا، ابتدا سے لے کر آخر تک جھوٹ ہی بولتا رہا۔ گرفتاری کے وقت جو کتابیں (تحریک سے متعلق لٹریچر) ہم نے خود پولیس کو دی تھیں، انھیں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے ہوئے کہا کہ تلاشی میں ان کے گھروں سے ملی ہیں، حالانکہ نہ وہ ہماری گرفتاری کے وقت موجود تھا، نہ ہی ہمارے گھروں کی تلاشی لی گئی تھی۔

ایک بات میں نے محسوس کی کہ یہ نوجوان جھوٹ بولنے میں ابھی مہارت حاصل نہیں کر سکا ہے۔ اس بے چارے کو مسجد والی زندگی ہی کی تعلیم دی گئی تھی، اس کے باہر دنیا میں کیسے زندگی گزارنا ہے اسے بتایا ہی نہیں گیا۔ کاش کہ اسے یہ بتایا جاتا کہ بھائی دنیا کی زندگی ہی سے آخرت کے لیے راستہ جاتا ہے۔ اس کے بعد دو پولیس افسروں کا بیان ہونا تھا لیکن معلوم ہوا کہ وہ کسی اور کیس میں الجھے ہوئے ہیں۔ دوپہر میں ڈھیر سارے کیس کے فائل جج کے ٹیبل پر تھے جس پر بہت ہی معذرت کے ساتھ انہوں نے ہمارے وکیل سے کہا کہ ان

لوگوں کو منگل یعنی ۱۶ ستمبر کو بلوالو، کہا درمیان میں ہفتہ، اتوار چھٹی ہے میں خود بنگلور جارہا ہوں، ہوسکتا ہے پیر تک لوٹوں اس لیے منگل کو بلوالو اور ہم جیل واپس آگئے۔

گاہے بہ گاہے ہمارے پاس آنے والے قیدیوں سے بات چیت ہوتی ہی رہتی تھی اور جب ہم ان سے پوچھتے کہ رہائی کے بعد کیا کروگے؟ تو فوراً جواب مل جاتا، کرنا کیا ہے ہمارا تو دھندہ ہی یہی ہے، اسے پھر سے شروع کریں گے۔ یعنی جیل کی سزا کے باوجود ان لوگوں کی کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔ جیسے آتے ہیں ویسے ہی بلکہ مزید پختہ ہوکر باہر نکلتے ہیں۔ ہاں کچھ دوسرے وہ لوگ جن سے انجانے میں غلطی ہوگئی تھی اچھی زندگی گزارنے کے خواہش مند تھے۔ اگر ان لوگوں کی صحیح ڈھنگ سے تربیت اور اصلاح کی جائے تو یہ اچھے شہری ثابت ہوسکتے ہیں۔

خیال تھا کہ منگل کے بعد بھی کہیں پولیس آفیسرس مزید وقت نہ لینے لگیں، ان لوگوں کی گرفت کرنے والا کوئی نہیں۔ لیکن یہ تسلیم بہرحال کرنا پڑے گا کہ ہمارے کیس سے متعلق دونوں SPI واقعی شریف تھے یا کچھ نہ کچھ شرافت ان میں موجود تھی۔ کوئی غلط بات انھوں نے ہمارے خلاف نہیں کہی۔ ان کے افسروں نے انہیں جو حکم دیا اسے وہ بجالائے۔ البتہ سرکاری وکیل کی بوکھلاہٹ اور اس کا کھوکھلا پن قابل دید تھا۔ ایک اہم بات یہ تھی کہ مجسٹریٹ شریف اور نڈر تھا۔ اس نے مسلسل تین تین دن ہمارے کیس کی سماعت کو جاری رکھا جو عام ججوں کے یہاں کم دیکھنے میں آتا ہے۔ البتہ ضمانتوں کی درخواستوں میں ہمارے وکلا سے کچھ غلطیاں ہوگئی تھیں جس کے بنا پر رہائی میں قدرے تاخیر ہوئی۔

یہ ہماری ۵۷ دنوں کی روداد ہے۔ ویسے جیل کی کہانی ایک لمبی داستان ہے۔ یہاں کا ہر قیدی ایک داستان اور ہر شخص گویا ایک افسانہ ہے۔ یہ داستانیں ایک بگڑے ہوئے معاشرے کی زندہ فریادیں ہیں جو عدل وانصاف کے لیے حق کی آواز بلند کررہی ہیں۔ آخر میں مجھے اخوانی قائد حسن البنا شہید کے مشورے یاد آرہے ہیں: ''اللہ پر ایمان رکھو، اسے اچھی طرح پہچانو، اس پر توکل واعتماد رکھو، اسی سے قوت حاصل کرو، اس کے علاوہ کسی سے نہ ڈرو، کسی اور کا خوف تمہارے دل میں نہ ہو۔

اس کے احکام بجالاؤ اور ممنوعات سے بچتے رہو۔ پاکیزہ اور بلند اخلاق بنو، نیکیوں کا دامن کبھی نہ چھوڑو۔ اخلاق ہی تمھاری قوت ہو۔ اللہ نے جو ایمان کی قوت تمھیں دی ہے اور نیکی وخداترسی کی فضیلت بخشی ہے وہی تمھارا سرمایۂ ناز ہو۔

قرآن پاک کے شیدائی بنو، سیرت پر مذاکرے کرو، باعمل اور صاحب کردار بنو۔ سخن ساز اور حجت باز نہ بنو۔ اللہ جب کسی کو ہدایت دیتا ہے تو اسے عمل کی توفیق بھی دیتا ہے۔ ہدایت کے ہوتے ہوئے جب کوئی غلط راہ پر جاتا ہے تو کٹ حجتی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ سراپا الفت کا پیام اور محبت کی زبان بنو۔ باہمی رشتوں کی جان ودل سے پاسداری کرو کہ یہی تمھاری قوت کار اور کامیابی کا ستون ہے۔ تنگی ہو کہ فراخی، خوشی ہو کہ غمی، کبھی سمع وطاعت کا دامن نہ چھوڑو کہ یہی تمھاری فکر کا تقاضا اور جمعیت کا شیرازہ ہے۔ پھر تم اللہ کی تائید و نصرت کی امید رکھو کہ وہ تو بہر حال آکے رہے گی اور اس وقت مومنین نصرت الٰہی سے شاد کام ہوں گے۔ بے شک وہ بڑا زبردست اور نہایت مہربان ہے۔"

امیر حلقہ بہار-جیل میں

□ محمد جعفر

مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

۲۶ / جون ۱۹۷۵ء کو ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی اور ۴/ جولائی کو کئی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ان جماعتوں میں جماعت اسلامی ہند کو بھی شامل کرلیا گیا۔ پورے ملک میں اس کے دفاتر بند کر دیے گئے۔ ذمہ داران جماعت اور عام ارکان کو بھی بالعموم گرفتار کرلیا گیا۔ کسی پر ڈی آئی آر اور کسی پر میسا کا اندھا قانون نافذ کیا گیا۔ جن پر میسا کی دفعات لاگو کی گئیں انہیں ایمرجنسی کے اختتام تک بالعموم قید و بند کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ امیر حلقہ بہار ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب بھی ایسے ہی بڑے مجرموں میں گردانے گئے اور تقریباً ۲۱ ماہ پابند سلاسل رہے۔ اس پوری مدت میں ان کے چہرے کی بشاشت اور تبسم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب کسی کی ضمانت ہوتی یا رہائی کی خوش خبری آتی اور جیل سے نکلنے والا خوش وخرم اپنے ساتھیوں سے جدا ہوتا تو اس کے ساتھیوں کے چہروں پر اپنے دوست کی آزادی پر جہاں خوشی کے آثار ہوتے وہیں ایک حسرت ویاس کی جھلک بھی نظر آتی کہ ان کی قسمت میں ابھی قید کے دن کاٹنے باقی ہیں۔ رہا ہونے والا ساتھی اپنے ساتھیوں سے کہتا، گھبراؤ نہیں تم بھی جلد ہی رہا ہو جاؤ گے۔ لیکن ان مواقع پر ڈاکٹر صاحب سے جدا ہونے والوں کی کیفیت بالکل مختلف ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کے سراپا سے طمانیت و مسرت پھوٹ پڑتی تو ان کو چھوڑ کر جانے والے ساتھیوں کے چہرے پر حسرت کے آثار نمایاں

ہوتے کہ کاش ڈاکٹر صاحب بھی ساتھ ہی رہا ہوتے یا اسے بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح ہی رہائی نصیب نہ ہوتی۔ کبھی دبی زبان سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا تو ڈاکٹر صاحب بڑے پیار سے سمجھاتے: آج تمہاری تو کل ہماری باری ہے۔ خوشی کا موقع ہے، افسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور مومن کے لیے تو پوری دینا ہی قید خانہ ہے۔ کب اسے جانوروں کی طرح چھوٹ ہے۔ غرض تسلی تشفی دلا کر ہنسی خوشی اپنے ساتھی کو رخصت کرتے۔

اپنے رفقا سے بہت بے تکلف رہتے تھے۔ میں کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا تھا۔ اکثر خیال ہوتا تھا کہ میں ان کی عمر اور بزرگی کا لحاظ نہیں رکھ پایا۔ کبھی یہ احساس شدت کے ساتھ ہوتا تو ان سے معذرت چاہتا تو بڑی بے تکلفی اور ظریفانہ انداز میں کہتے ''اچھا آپ مجھ سے کم بزرگ ہیں کیا؟ بچپن سے تو راست بڑھاپا آیا اور یہ خوش فہمی ہے کہ شاید ابھی جوان ہی ہیں۔ اچھا چلو اگر مجھ سے زیادہ بوڑھے نہیں تو برابر ضرور ہو گے۔ تم کو تو برابری سے بات کرنی ہی چاہئے''۔ اسی بے تکلفی کی وجہ سے میں شوخ ہو گیا تھا۔ چناں چہ گرفتاری کے چند ماہ بعد جب میری رہائی کا آرڈر آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں آپ کے ساتھ جیل میں آیا تھا ساتھ ہی یہاں سے باہر جاؤں گا، تو مجھے سمجھانے لگے کہ یہ بات مناسب نہیں ہے، جب تمہاری ضمانت ہو گئی ہے تو باہر چلے جانا چاہئے۔ میں نے جب یہ بات کہی کہ میں ضمانت پر نکلنا نہیں چاہتا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ میرا حکم ہے۔ میں نے شوخی کے ساتھ جواب دے دیا کہ نہیں اس معاملے میں آپ کی بات نہیں مانوں گا تو وہ ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ مومن آزمائش کو دعوت نہیں دیا کرتا، البتہ اگر آزمائش سے اللہ تعالیٰ اسے دوچار کرے تو اس میں ثابت قدمی دکھاتا ہے۔ ان کی اس توجہ دہانی پر اپنی غلطی اور بے جا جسارت پر شرمندگی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

۴ر جولائی ۱۹۷۵ء کو مجھے جماعت پر پابندی لگنے کی خبر ایک اخبار کے دفتر میں ملی تھی۔ میں اشاعت کے لیے ایک خبر شائع کرانے کے لیے لے کر وہاں پہنچا تو اخبار والوں نے کہا کہ جماعت کی خبر اب شائع نہیں کی جائے گی کیوں کہ اس پر پابندی عائد ہو گئی ہے۔ میں نے اسی وقت دفتر حلقہ فون کیا۔ دفتر کی چھٹی تھی لیکن جیسے ہی یہ اطلاع میں نے دی ڈاکٹر

صاحب نے دریافت کیا کہ یہ خبر میں نے خود سنی ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں خبر مصدقہ ہے تو فرمایا فوراً دفتر آجاؤ۔ دفتر پہنچتے ہی انھوں نے ہدایت کی کہ بیت المال کے اس دن تک کے حسابات رجسٹر میں درج کر دیے جائیں گے تاکہ دیکھنے والوں پر جماعت کا تاثر بہتر رہے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پولیس آگئی اور دفتر میں موجود لوگوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگائی گئیں اور ڈاکٹر صاحب کو ہتھکڑی کے ساتھ کمر میں رسّا بھی لگایا گیا۔ میں نے اس پر اعتراض کیا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ تو حکومت کے کارندے ہیں، ان سے کیا کہنا ہے، انہیں اپنی ڈیوٹی انجام دینے دو۔ اس پر پولیس والوں کا رویہ بدل گیا اور وہ معذرت کرنے لگے کہ وہ حکم کے تابع ہیں، جیسی ہدایت کی گئی ہے ویسا ہی کر رہے ہیں۔ اس سے قبل تک ان کا رویہ بڑا ہی تلخ اور تحکمانہ تھا۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر اعلیٰ حکام سے ربط قائم کیا گیا۔ چناں چہ جو غیر ارکان تھے انہیں اسی وقت چھوڑ دیا گیا اور ارکان کو حوالات میں بند کر دیا گیا جہاں بڑی گندگی اور بدبو تھی۔ زمین اس قابل نہیں تھی کہ اس پر بیٹھا یا نماز ادا کی جاسکے۔ عشاء کے وقت ہم نے گزارش کی کہ کسی صاف جگہ پر نماز پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے تو انکار کر دیا گیا۔ پھر وضو کے لیے پانی طلب کیا گیا تو اس سے بھی انکار کیا گیا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ظالموں سے درخواست کرنا مناسب نہیں ہے، تیمّم کر کے نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ ہمارے ساتھ ایک مریض اظہار کریم صاحب مرحوم تھے۔ طبیعت کی خرابی، بخار اور کمزوری کے سبب کمبل ان کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اسی کمبل پر نماز پڑھ لی جائے اور اسی پر اظہار صاحب آرام کر لیں۔ ہم لوگ کھڑے رہ کر بھی وقت گزار سکتے ہیں۔ چناں چہ تقریباً چوبیس گھنٹے ہمارے اس متعفن تکلیف دہ جگہ پر گزرے۔ دوسری شام ہمیں پھلواری شریف کیمپ جیل پہنچایا گیا۔ رات ہو چکی تھی، جیل کے تمام وارڈ اس وقت بند ہو چکے تھے۔ ہمیں پہلی رات عادی مجرموں کے وارڈ میں رکھا گیا۔ وہ رات بھی خاصی تکلیف دہ تھی۔ جگہ کی تنگی اور جرائم پیشہ لوگوں کے انداز واطوار سے ذہنی کوفت اور گھٹن ہو رہی تھی۔ ہم نے جب یہ کہا کہ ہمیں مجرموں کے ساتھ کیوں رکھا جا رہا ہے تو جیل کے عملوں کے بولنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے اپنا موقف

دہرایا کہ ہمیں ظالموں سے نہ گزارش کرنی ہے نہ شکایت۔ صبر و شکر کا دامن تھامے رہنا چاہیئے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی دہرائی کہ یہ بے چارے تو ظالم حکومت کے ملازم ہیں، ان سے کچھ کہنے کا کیا حاصل ہے، یہ وہی کریں گے جو انہیں کہا جائے گا۔ یہ سن کر وہ عملے فوراً نرم پڑ گئے۔ پہلے تو یہی کہہ رہے تھے کہ ہمارے پاس جو جگہ ہے اسی میں رہنا ہوگا لیکن اب یہ کہنے لگے کہ آج رات کسی طرح گزار لیجئے، کل صبح سے سیاسی قیدیوں کے وارڈ میں انتظام کی کوشش کریں گے۔ بہر حال یہ رات اس رات سے بہتر کٹی جس رات ہمیں حوالات میں بند رکھا گیا تھا۔ دوسرے دن ہمیں سیاسی قیدیوں کے وارڈ میں منتقل کرنے کا مسئلہ بھی خاصا پیچیدہ ہو گیا کیوں کہ آر ایس ایس اور جن سنگھ والے کسی طرح اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں تھے، سوشلسٹ بھی مذہبی لوگوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کر رہے تھے۔ اور ان دونوں کی تعداد بہت تھی۔ جیل کے عملے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ ہم بھی سیاسی قیدی ہیں۔ یہ کیمپ جیل ہے۔ گرفتاریاں زیادہ ہو رہی ہیں۔ اگر ہر پارٹی کے لوگ یہ چاہیں گے کہ وہ الگ الگ وارڈ میں رہیں اور کوئی دوسرا ساتھ نہ رہے تو بڑی مشکل ہوگی۔ لیکن کوئی سمجھنے کو تیار نہیں تھا، البتہ جیل اتھاریٹی کو ہر پارٹی کے لوگ اس بات پر لعن طعن ضرور کر رہے تھے کہ سیاسی قیدیوں کو مجرموں کے وارڈ میں کیوں رکھا؟ عجب صورت حال تھی۔ ایک طرف ہمارے لیے عملوں سے احتجاج اور دوسری طرف اپنے ساتھ رکھنے پر راضی نہیں! آنند مارگی تعداد میں کم تھے۔ عملوں نے ان پر زور ڈالنا شروع کیا لیکن وہ سب سے زیادہ برہم ہوئے۔ کہنے لگے کہ مسلمان ہیں، گوشت، مچھلی، انڈا، لہسن، پیاز کھائیں گے، اور ہم ان چیزوں کو ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے ان کی بو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ ہمارے وارڈ کے کسی قریبی وارڈ میں بھی اگر رکھے جائیں گے تو ہم احتجاج کریں گے۔ اس پر ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب نے برملا کہا کہ ہم وہ چیزیں نہیں کھائیں گے جس سے کسی کو تکلیف ہو۔ یہ سنتے ہی جیلر کے ساتھ ساتھ جن سنگھ، آر ایس ایس، آنند مارگ اور تمام ہی سیاسی و سماجی پارٹیوں کے ذمہ داران حیران ہو گئے۔ شری جے پرکاش نارائن کے بعض قریبی لوگ کہنے لگے، ایسے لوگوں کو adjust نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ آنند مارگی کہنے لگے، آپ لوگ اگر گوشت مچھلی نہ کھائیں تو

سبزی، دال میں تو لہسن پیاز کا استعمال کریں گے، اس کے بغیر آپ کو کھانا اچھا لگے گا ہی نہیں۔ ہماری خاطر آپ یہ زحمت کیوں کریں گے جب کہ آپ کو یہاں اپنی مرضی کا کھانا کھانے کا حق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے برجستہ فرمایا ارے بھائی ہم جینے کے لیے کھاتے ہیں کھانے کے لیے نہیں جیتے، پھر ایسا کام جس سے کسی کو تکلیف پہنچے ہمارے نزدیک درست نہیں ہے۔ ہم اپنے ساتھیوں اور پڑوسیوں کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔ اب سب کو خیال ہونے لگا کہ اس اونچی بات کا جواب اونچائی سے ہی دینا چاہئے۔ لوگ کہنے لگے کہ جناب ایسا کھانا جس کے آپ عادی نہ ہوں اگر آپ کھائیں گے تو آپ کی صحت متاثر ہو سکتی ہے اور ہم اسے کیسے پسند کر سکتے ہیں کہ ہماری خاطر آپ لوگوں کی صحت متاثر ہو جائے، یہ تو جیل کے عملے بھی پسند نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا جو لوگ یہ چیزیں نہیں کھاتے ان کی صحت تو بہت اچھی معلوم ہو رہی ہے، اور وہ اپنی جسمانی و روحانی صحت کی خاطر ہی تو ایسی چیزیں نہیں کھاتے، پھر ہماری صحت کیسے خراب ہو جائے گی۔ اس پر سب لاجواب ہو گئے۔ بالآخر آنند مارگ کے چند نوجوانوں نے کہا کہ ہمیں ''چاچا'' کے ساتھ رہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے اگر وہ واقعی ان چیزوں کو استعمال نہ کریں۔ اس وقت سے ڈاکٹر صاحب زیادہ تر جیل میں ''چاچا جی'' کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ اطمینان رکھیں ہم آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ اور جہاں تک کھانے کا سوال ہے تو ہمارا راشن پانی سب آپ کے ذمہ ہوگا۔ آپ جو چاہیں بنائیں اجتماعی طور سے ہم اس میں شریک رہیں گے۔ وہی کھائیں گے جو آپ کھائیں گے، وہی پئیں گے جو آپ پئیں گے۔ اس فیصلہ سے ہمیں تردد ہوا کہ نہ معلوم کیسا کھانا کھانا پڑے گا اور کب تک کھانا پڑے گا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے فیصلے سے اختلاف کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ہم سب اس کے فوراً بعد ہی اس وارڈ میں منتقل ہو گئے جہاں آنند مارگی چند نوجوان تھے اور کسی کو اپنے ساتھ رکھنے پر اب تک آمادہ نہیں کئے جا سکے تھے۔ اب وہ وارڈ آنند مارگ اور جماعت اسلامی کا مشترکہ وارڈ ہو گیا۔ ہمارے جو لوگ بھی گرفتار ہو کر آئے اسی میں پناہ لیتے رہے اور بغیر لہسن پیاز کی سبزی دال بخوشی کھاتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب مغرب کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔

آنند مارگی بھی سورج غروب ہونے کے بعد کچھ عبادت کرتے اور تھالیاں بجا کر کچھ مذہبی گیت زور زور سے گاتے تھے۔ ایک دو دن کے بعد ان کو احساس ہوا کہ ہم لوگوں کو ان کے گانے بجانے سے disturbance ہوتا ہوگا۔ کہنے لگے کہ چاچا جی آپ کو نماز میں تکلیف ہوتی ہوگی۔ آپ ہماری تکلیف کا اتنا خیال کرتے ہیں، اچھا نہیں لگتا کہ ہماری کسی بات سے آپ کو تکلیف پہنچے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ نماز کے بعد بھی اتنی دیر تک بیٹھ کر کچھ عبادت کرتے ہیں کہ اگر ہم اپنی عبادت کو موخر کرنا چاہیں تو ہمارا وقت نکل جائے گا۔ اس لیے ہم پانچ دس منٹ میں اپنا کام کر لیں پھر آپ اطمینان کے ساتھ پڑھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، نماز وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا فرض ہے اور اول وقت ہی میں ادائیگی کو فضیلت ہے، اس لیے اگر آپ کے پاس موخر کرنے کی گنجائش ہو تو کر لیجئے ورنہ کوئی حرج نہیں ہے۔ چند دنوں میں ہم عادی ہو جائیں گے، ہم کو انشاء اللہ کوئی دقت نہ ہوگی۔ اس جواب کے بعد کچھ دنوں تک تو انھوں نے اپنا معمول جاری رکھا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد جیسے جیسے وہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے متاثر بلکہ مرعوب ہوتے چلے گئے اپنے معمولات میں تبدیلی کرتے چلے گئے اور ہر کام میں ہمارے معمول کو ترجیح دینے لگے۔ چناں چہ وہ اپنی یہ عبادت عشاء کی نماز کے بعد تقریباً آدھا گھنٹہ ادا کرنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے درس قرآن کو دعوت و تربیت کا ذریعہ ہمیشہ بنائے رکھا۔ چناں چہ جیل میں بھی ہفتہ وار درس کا سلسلہ اپنوں کے درمیان شروع کر دیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد کچھ دوسرے لوگ بھی شرکت کرنے لگے۔ اس میں جن سنگھ، سوشلسٹ، آنند مارگی، آر ایس ایس، سرودیہ، ایس پی ایم، سی۔ پی۔ آئی اور سی۔ پی۔ آئی (ایم ایل)، سب کے لوگ باری باری شریک ہونے لگے۔ سی۔ پی۔ آئی (ایم ایل) جن سنگھ اور آر ایس ایس سے متعلق تین چار افراد تو بہت قریب آ گئے تھے۔ (ان میں ایک موار صاحب تھے) درس کے علاوہ بھی سوالات کرتے تھے۔ ایک آنند مارگی نوجوان نے تو ہمارا لٹریچر بہت پابندی سے مطالعہ کیا، اور ہم سے یہ کہا کہ ہم اندر سے ان تعلیمات کو ہی درست سمجھ رہے ہیں لیکن یہاں اس کے اظہار کی ہمت نہیں پاتے۔ ڈاکٹر صاحب کا درس قرآن بڑا ہی سائنٹفک اور متاثر کن ہوتا

تھا۔ چناں چہ ان کا درس سننے کے بعد سرو ودیہ کے ایک کارکن نے کہا کہ گرچہ ہم لوگ ''وچار گوشٹی'' میں اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ کسی مذہب کی بات نہ آئے لیکن اگر اپنی مذہبی بات بھی ہمارے درمیان پیش کریں تو ہم اسے سننا اور سنانا پسند کریں گے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ڈاکٹر صاحب کے طرز استدلال، خوش اخلاقی اور کردار کی بلندی کا سکہ ہر پارٹی کے لوگوں نے مان لیا۔ یہاں تک کہ جرائم پیشہ لوگ اور جیل کے ذمہ داران بھی اپنے جھگڑے چکانے کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف سے رجوع کرنے لگے۔ اسسٹنٹ جیلر پاٹھک جی اتنا متاثر تھے کہ اکثر درس میں شرکت کی کوشش کرتے اور گھنٹوں ہم لوگوں سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے اور لٹریچر مانگ کر لے جاتے۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے چند ہی دنوں بعد پٹنہ میں غیر معمولی سیلاب آ گیا۔ شہر کے بڑے حصے اور بڑی بڑی کالونیاں زیرآب ہو گئیں۔ جیل میں بھی پانی داخل ہو گیا لیکن جلد ہی قابو پالیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں موجود تمام ہی لوگوں سے کہا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا ہے لیکن ہمارے بھائی اس وقت ہزاروں کی تعداد میں پریشان ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم یہاں رہتے ہوئے ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ سبھی کہنے لگے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں، ہم کو تو سرکار نے جیل میں بند کر دیا ہے، یہ سرکار کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کی امداد کا معقول نظم کرے اور ہماری مدد کی ضرورت ہے تو ہمیں رہا کرے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں ایک دن کا راشن خود استعمال کرنے کے بجائے اس کے کھانے تیار کرا کے کسی ذریعہ سے اپنے پریشان حال بھائیوں کو بھجوانے کا نظم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سنتے ہی سب لوگوں نے اس پر عمل کرنے کا اظہار کیا اور اجتماعی طور سے روٹی سالن وغیرہ تیار کرا کے سیکڑوں کلو جیل اتھارٹیز کے ذریعہ امدادی ٹیم کے لوگوں کو بلا کران کے حوالے کیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد جب کوئی ایسی خبر آتی جو سب کی دلچسپی کی ہوتی یا سب کے لیے قابل توجہ تو ڈاکٹر صاحب سے مشورے کے لیے لوگ آ جاتے اور مشوروں میں فیصلہ کن بات ڈاکٹر صاحب کی تسلیم کی جاتی۔ انہیں دنوں جیل کے عملوں نے بتایا کہ سیاسی قیدیوں کے لیے کپڑے آ گئے ہیں۔ دھوتی، کرتے، لنگیاں، بنیان، تولیہ وغیرہ ہر شخص کے لیے دوسیٹ فراہم کئے جانے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے لینے سے انکار کر دیا۔ فوراً لوگ رجوع ہوئے کہ کیوں انکار کیا یہ تو ہمارا حق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ کپڑے سیلاب زدگان کو پہنچائے جائیں، چناں چہ اس کی بھی مہم چل پڑی اور خاصے کپڑے جیل سے سیلاب زدگان کو مختلف ذرائع سے بھجوائے گئے۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے چند ہی دنوں بعد ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ گرفتار کر کے جیل میں لائی گئیں۔ ان کا بلڈ پریشر غیر معمولی بڑھا ہوا تھا۔ بستر علالت سے انہیں اس حالت میں گرفتار کیا گیا کہ وہ خود سے اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا تو بے چین ہو کر گیٹ تک آئے لیکن جیل کے ذمہ داروں نے ان کو اہلیہ سے ملاقات نہیں کرنے دیا اور چوں کہ اس جیل میں خواتین کے لیے نظم نہیں تھا اس لیے موصوفہ کو واپس بھیج دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ ملاقات کی گزارش نہیں کی۔ دیگر سیاسی قیدیوں کو جب اس کی خبر ہوئی تو سب احتجاج کرنے لگے اور جیلر وغیرہ کو برا بھلا کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں منع کیا اور صبر و شکر کا ایسا مظاہرہ کیا کہ لوگ حیران ہو کر کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب آخر کب تک آپ اس طرح ظلم کو برداشت کرتے رہیں گے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اللہ کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارے وارڈ میں بہٹا مارکیٹ کے مالک رام نیواس سنگھ بھی زیر حراست تھے، ان کے نامور وکلا اور انتظامیہ وغیرہ سے قریبی تعلقات تھے۔ وہ کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب آپ مجھے اجازت دیں، میں آپ کی اہلیہ کو چوبیس گھنٹے میں رہا کرا کے گھر بھجوا سکتا ہوں۔ آج کل ہر کام رشوت اور پیروی سے ممکن ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواباً بڑے سکون کے ساتھ فرمایا: ''میں غلط طریقے سے باہر نکلنے کے بجائے جیل میں رہنا اور مرنا پسند کروں گا اور یہی بات مجھے اپنے گھر والوں کے لیے بھی پسند ہے۔'' ہر شخص کو تشویش تھی کی اس قدر بیمار عورت جیل میں کس طرح رہ سکے گی! خود ڈاکٹر صاحب غیر معمولی اضطراب کا شکار تھے اور اکثر سنٹرل جیل سے ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے رفقا کو کہتے اور خیریت کی خبر کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے، اور ساتھ ہی رفقا کو کہتے کہ غلط طریقے سے انہیں آزاد کرانے کی کوشش نہ کرنا اور نہ حکومت سے کوئی گزارش کرنا۔ تقریباً دو ماہ پر وہ

ضمانت پر رہا ہوئیں تو ان کی حالت بہت غیر ہو چکی تھی۔ وہ کسی دوسرے ڈاکٹر سے علاج کرانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب جیل ہی سے دوا تجویز کرتے رہے، لیکن موصوفہ کی حالت بگڑتی گئی تو رفقا نے ڈاکٹر صاحب کے Provisional bail کے لیے کوشش کی۔ چوں کہ ڈاکٹر صاحب کو MISA کے تحت گرفتار کیا گیا تھا جس میں ضمانت پر رہائی نہیں ہوتی تھی اس لیے پندرہ دنوں کے لیے Provisional bail کا آرڈر ملا تا کہ وہ اپنی اہلیہ کو دیکھ سکیں اور ان کا علاج کرا سکیں، لیکن ڈاکٹر صاحب نے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کی رہائی میں ایک پیسہ بھی ناجائز خرچ نہ ہو لہٰذا اس آرڈر پر عمل درآمد میں تقریباً دو ماہ لگے۔ صرف دس روپے ناجائز خرچ اور رشوت دینے سے بچنے کے لیے ڈاکٹر صاحب دو ماہ صبر آزما حالات سے گزرے۔ بالآخر جیل سے باہر محض پندرہ دنوں کے لیے آئے اور ان کی توجہ و علاج سے اہلیہ کی حالت کچھ سنبھلنے لگی تو دوبارہ جیل چلے گئے، حالانکہ اب بھی موصوفہ کی حالت تشفی بخش نہیں ہو سکی تھی۔ ان کے صبر و تحمل، خوش اخلاقی اور کردار کی اس بلندی کو دیکھ کر جیل کے تمام ساتھیوں اور ذمہ داروں کے دلوں میں ان کے لیے اور بھی جگہ بن گئی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ احترام و محبت سے پیش آنے لگے۔

ہم سب لوگ جب گرفتار ہوئے تھے تو ہمیں (Defence of India Rule) D.I.R کے تحت گرفتار کیا گیا تھا جس میں ضمانت ہو سکتی تھی۔ چناں چہ تقریباً ۴ ماہ بعد میری ضمانت اور دیگر رفقا کی ضمانتیں ہوتی چلی گئیں لیکن ڈاکٹر صاحب پر دو ماہ کے اندر ہی MISA لگا دیا گیا تھا جس کے بعد ضمانت کا امکان ختم ہو چکا تھا۔ البتہ MISA والوں کو جیل میں D.I.R والوں کی بہ نسبت سہولیات و مراعات زیادہ تھیں۔ چناں چہ ہم سب لوگوں کو زمین پر کمبل بچھانے کے لیے دیے گئے تھے۔ جب ان کو MISA کی خوشخبری سنائی گئی تو آرام کرنے کے لیے ایک چوکی (تخت) فراہم کی گئی۔ ہم لوگوں نے جب ان کا بستر اس پر لگانا چاہا تو انھوں نے فرمایا کہ امتیاز مجھے پسند نہیں۔ آپ لوگ فرش پر سوئیں اور میں تخت پر۔ ہم سب لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ بوڑھے آدمی ہیں، صحت کمزور ہے اور نہ معلوم کب تک جیل میں رہنا پڑے، جب حکومت نے ہی یہ امتیاز روا رکھا ہے کہ آپ پر

الگ دفعہ لگائی تو برابری کیسے کر سکتے ہیں؟ لیکن وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ اس پر کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جائیں، چناں چہ ایسا ہی کرنا پڑا۔

اس تخت پر پورے وارڈ کے لوگوں کے کھانے پینے کے سامان رکھے جانے لگے۔ دیگر سیاسی قیدیوں میں سے جسے تخت کی سہولت ملی وہ اس کی پروا کیے بغیر کہ اس کے ساتھی کس حال میں ہیں سہولت سے فائدہ اٹھانے لگا۔ کھانے پینے کی چیزیں، دوائیں، پھل وغیرہ کی سہولیات بھی MISA والوں کو زیادہ ملنے لگیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا معمول یہ تھا کہ جو چیز بھی ملتی وہ رکھ دی جاتی اور جب تک اس کی مقدار اتنی نہ ہو جاتی کہ وارڈ کے سب لوگوں کو مل سکے تب تک وہ ہاتھ نہ لگاتے۔ پھر سب کو تقسیم کرتے۔ آنند مارگی ساتھی اس کردار سے اتنا متاثر ہوئے کہ اب انہیں ہر وقت یہ خیال رہتا کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچائیں، اور تمام تر کوششوں کے باوجود وہ ڈاکٹر صاحب سے بازی نہ لے جا سکے، نہ ہم میں سے کوئی۔ ہر شخص کا سب سے زیادہ خیال ڈاکٹر صاحب ہی رکھتے اور سب کو آرام پہنچاتے۔ خود تکلیف سے رہتے۔ وارڈ میں سب سے تکلیف دہ جگہ اپنے لیے منتخب کی۔ سب سے خراب پلیٹ اپنے کھانے کے لیے منتخب کرتے اور اچھی پلیٹ، اچھا بستر دوسروں کو دیتے۔ ان کی عبادت اور درود و وظائف کے اہتمام کو دیکھ کر آنند مارگی ساتھی کہنے لگے کہ ''چاچا جی'' کا Concentration بہت اچھا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب گوشت وغیرہ پسند نہیں کرتے اور ممکن ہے کہ گھر پر بھی غذا کا یہی معمول ہو۔ لہسن، پیاز، گوشت وغیرہ کھانے سے Concentration متاثر ہو جاتا ہے اور چہرے کی چمک جاتی رہتی ہے، اسی لیے ہمارے گرو نے ہمیں ان چیزوں سے پرہیز بتایا ہے۔ جب میں نے ان سے کہا کہ ''چاچا جی'' تو روزانہ بڑے کا گوشت کھاتے ہیں تو انہیں یقین نہیں آیا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ روزانہ گوشت پیاز وغیرہ کھانے والے کے چہرے پر ایسی رونق اور اتنا ذہنی ارتکاز کیسے ممکن ہے! میں نے عرض کیا کہ بے چارے ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ ذی فراش ہیں، کھانا پکا نہیں سکتیں۔ وہ سبزی دھوئیں، کاٹیں اور پکائیں اس کی بجائے روزانہ تھوڑا گوشت خرید کر لاتے ہیں اور دھو کر پکا لیتے ہیں، یہی آسان ہے تو انہیں

بات سمجھ میں آ گئی اور ان کا اپنے فلسفہ پر سے بھی اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ دوسرے ہی دن کہنے لگے کہ ''چاچا جی'' جب روزانہ گوشت انڈا وغیرہ کھاتے ہیں تو یقیناً ان کی صحت ان چیزوں کے بغیر متاثر ہو جائے گی اور یہ سب ہماری وجہ سے ہوگا، اب تو ہم کسی بھی طرح اتنے اچھے آدمی کی صحت خراب ہونے نہیں دیں گے۔ انہیں گوشت انڈا وغیرہ MISA کے تحت دیا جاتا ہے اور وہ ہماری خاطر انکار کرتے ہیں، ہم اسے لے کر انہیں کھلائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب تنہا کوئی چیز کھاتے نہیں۔ آپ لوگ نہ کھائیں اور وہ کھالیں اس کی توقع ان سے نہیں ہے۔ ان ساتھیوں نے کہا کہ ہم چاچا جی کو تیار کرلیں گے۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب سے انھوں نے گزارش کی کہ وہ گوشت انڈا اپنے کوٹے کا واپس نہ کیا کریں، لے لیا کریں اور استعمال کریں۔ پیاز، لہسن جو خواہش ہو استعمال کریں، انہیں اس پر اب کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اعتراض نہ سہی لیکن آپ لوگوں کو ان چیزوں سے جب تکلیف پہنچتی ہے اور آپ لوگ جب ان چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں تو آپ کے درمیان رہ کر ان چیزوں کو استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجبوراً انہیں یہ کہنا پڑا کہ اچھا آپ کی خاطر ہم بھی انڈا کھالیں گے۔ گوشت اور لہسن پیاز تو نہیں کھا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میری خاطر انڈا کھانے کی ضرورت نہیں ہے، جب آپ کھانے لگیں گے تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ چناں چہ روزانہ ڈاکٹر صاحب کو دو انڈے کا Provision تھا وہ لیا جانے لگا۔ جب اتنے انڈے جمع ہو گئے کہ وارڈ کے ہر فرد کا حصہ لگ سکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ایک ساتھ اسے ابالا جائے یا فرائی کیا جائے اور سب ایک ساتھ کھائیں۔ اب گویا ہر ہفتہ دس روز اس طرح ایک انڈا ڈاکٹر صاحب اوروں کے ساتھ استعمال کرنے لگے جب کہ انہیں دو انڈے روزانہ ملا کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد آنند مارگی ساتھی گوشت لہسن پیاز سب ڈاکٹر صاحب کی خاطر لینے لگے اور سب کچھ خود بھی کھانے لگے۔ اس پر دوسرے وارڈ میں مقیم آنند مارگیوں نے بڑا واویلا مچایا لیکن کسی کو بھی ڈاکٹر صاحب سے شکایت نہ تھی، کیوں کہ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب ایسے آدمی نہیں ہیں جو ان کے ساتھیوں کو غلط طریقے سے ان چیزوں کا

استعمال کرائیں، انہیں شکایت اپنے ساتھیوں سے تھی کہ وہ کمزور پڑ گئے۔ جو لوگ اس وجہ سے ہمیں اپنے وارڈ میں جگہ دینے کو تیار نہ تھے کہ ہم گوشت، انڈا لہسن، پیاز کھانے والے لوگ ہیں وہ محض ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور کردار سے متاثر ہو کر یہ چیزیں پکا کر ہمیں کھلانے لگے اور خود بھی کھانے لگے۔

جیل میں کئی سوشلسٹ مسلمان جو نماز نہ تو پڑھتے تھے نہ پڑھنا جانتے تھے، بغیر کچھ توجہ دلائے محض ڈاکٹر صاحب سے متاثر ہو کر نماز کے پابند ہو گئے۔ نماز سیکھی اور باجماعت ہمارے ساتھ ادا کرنے لگے۔

جیل میں کئی قیدی ایسے تھے جو برسوں سے وہاں پڑے ہوئے تھے۔ کوئی ان کی ضمانت کرانے والا نہیں تھا۔ نہ ان پر مقدمہ چل رہا تھا نہ ان کی کوئی سزا ہوئی تھی۔ وہاں کے خراب ماحول کا اثر قبول کرتے جا رہے تھے۔ اس جانب بھی ڈاکٹر صاحب نے توجہ فرمائی اور ایسے چند لوگوں کی ضمانت کرائی اور انہیں رہا کرا کے روزگار سے لگانے کی کوشش کی۔ ان کے اندر کافی سدھار آیا۔ یہ دیکھ کر بعض سیاسی رہنما بھی اس جانب متوجہ ہونے لگے۔

ڈاکٹر صاحب ایک اچھے معالج بھی تھے۔ جیل میں ہر سطح کے لوگوں کو مفت طبی مشورہ کے علاوہ بعض کو دوائیں مفت فراہم کراتے رہے۔ لوگوں کی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس کا بھی بڑا خوش گوار اثر جیل کے ساتھیوں نے قبول کیا۔ رہائی کے بعد بھی برسوں ایسے لوگوں نے ربط قائم رکھا۔

جن سنگھ کے جنرل سکریٹری (بہار) رام لکھن گپتا ایم۔ پی مونگیر کے رہنے والے تھے۔ وہیں سے پارلیمنٹ کا انتخاب جیت کر آئے تھے۔ ہم لوگوں سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ اکثر آ کر اسلامی تاریخ پر تبادلۂ خیال کرتے۔ آر ایس ایس والوں سے بحث کرتے کہ مسلمانوں کے بارے میں ان کا تصور درست نہیں ہے۔ جیل میں رہتے ہوئے جب گپتا جی نے الیکشن لڑا تو ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی کہ وہ ان کے لیے دعا کریں اور اپنے ساتھیوں کو Support کرنے کے لیے کہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی شخصی تعلقات کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ انھوں نے عبدالودود صاحب کو بلا کر یہ فرمایا کہ مونگیر کے رفقا کو گپتا جی کی حمایت کے

لیے متوجہ کر دیں۔ گپتا جی نے ڈاکٹر صاحب سے متاثر ہو کر جن سنگھ سے تعلق رہنے کے باوجود آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کو ترجیح دیا تھا۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر عبدالودود صاحب نے مونگیر کا سفر کیا اور وہاں عبدالخالق بادل صاحب وغیرہ کو اس جانب متوجہ کیا۔

آر ایس ایس کے پٹنہ ضلع کے انچارج بھی ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ہم جو بھی لٹریچر دیتے بخوشی لے کر پڑھتے اور اکثر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر ایک رفیق کے گھر سے ایک بچہ ناشتہ دان میں گوشت لے کر آ گیا۔ ہمارے گھر والوں کو معلوم تھا کہ جیل میں کوئی چیز بھیجنے پر پابندی نہیں ہے اس لیے گوشت پکا کر بچہ کے ہاتھ بھیج دیا۔ گھر کے سب لوگ مصروف رہے ہوں گے۔ گیٹ پر ایک کانسٹیبل نے پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ بچہ نے کہا کہ گائے کا گوشت ہے۔ یہ سن کر وہ بچہ کو برا بھلا کہنے لگا۔ پھر اسے شرارت سوجھی، اس نے بچہ سے کہا کہ ناشتہ دان اندر لا کر رکھ دے۔ بچہ رکھ کر چلا گیا۔ وہاں پر موجود ایک غیر مسلم ملاقاتی نے آ کر ہمارے کسی ساتھی سے کہا کہ آپ کی سوغات آئی ہے۔ اسی دوران اس کانسٹیبل نے یہ شرارت کی کہ Criminal قیدیوں کو ورغلایا کہ میاں جی لوگوں نے گائے کا گوشت منگایا ہے! یہ سن کر وہ سب جذبات میں آئے اور ہمارے وارڈ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور گالیاں دینے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ پھر آپس میں کوئی جھگڑا ہوا، وہ باہر جانے لگے کہ سمجھائیں گے اور جھگڑا ختم کرائیں گے، لیکن ایک آنند مارگی ساتھی نے کہا کہ چاچا جی آپ بیٹھیں، میں پہلے معلوم کر کے آتا ہوں کہ کیا جھگڑا ہے؟ وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ چاچا جی وہ تو آپ ہی لوگوں کے خلاف نعرہ لگا رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں۔ آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ بڑے غم و غصے کا ماحول ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ پھر تو مجھے ضرور جانا چاہئے۔ وہ نکل پڑے۔ انہیں باہر نکلتے دیکھ کر Criminal غصہ میں مارنے کو آگے بڑھے۔ ان کے پیچھے آر ایس ایس، جن سنگھ، سوشلسٹ سب جمع ہو گئے اور نعرے لگانے لگے۔ آر ایس ایس کے ضلعی ذمہ دار جو ڈاکٹر صاحب سے بہت متاثر تھے ان کو کسی نے جا کر کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو لوگ مارنے کے لیے

بڑھ رہے ہیں تو وہ تیزی سے آئے اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے سیدھے ڈاکٹر صاحب کے قریب پہنچ گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں ہے، سنا ہے کہ کوئی بچہ کھانے پینے کی چیز لایا ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں گائے کا گوشت ہے۔ واللہ اعلم۔ اس نے پوچھا کہ کیا واقعی ایسا ہے یا ہوسکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے صفائی سے کہا کہ بچہ ہے، بڑے کے گوشت کا عام طور پر مسلمان گھرانوں میں گائے کا گوشت بھی کہتے ہیں۔ یا تو اس نے غلط سمجھا ہوگا یا یہ بھی ممکن ہے کہ کسی گھر میں گائے کی قربانی واقعی ہوئی ہو۔ چوں کہ ہمارے یہاں تو یہ جائز اور پسندیدہ ہے اور ہم شوق سے کھاتے ہیں، آج عید کا دن ہے اور اس لیے لوگوں نے ہمیں بھیجا ہوگا لیکن ہم نے منگایا نہیں ہے۔ اگر جیل میں اس کے آنے کی اجازت نہیں ہے تو واپس کر دیا جائے اور اگر اجازت ملتی ہے تو ہم کھائیں گے۔ فضا بڑی خراب ہو چکی تھی لیکن آر ایس ایس کے ذمہ دار نے جب یہ دوٹوک بات ڈاکٹر صاحب کی زبان سے سنی تو برا نہیں مانا، کیوں کہ وہ دل سے ان کے قدرداں ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ اندر جائیں ہم سنبھالتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب وہیں پر ٹھہرے رہے اور کہا کہ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ہمارے بھائی غلط فہمی کے شکار ہیں، انشاء اللہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ اللہ ہمارا محافظ ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔ اس بات نے ان کو اور بھی متاثر کیا اور وہ ایک اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر آر ایس ایس والوں سے کہنے لگے کہ آر ایس ایس کے ساتھی اس بھیڑ سے الگ ایک طرف ہو جائیں! سب ایک طرف ہو گئے تو انھوں نے چیخ کر فرمایا کہ آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں کس طرح کے لوگ رہتے ہیں؟ اگر یہاں گائے کا گوشت آیا ہے تو جیل کے ذمہ داروں نے اسے کیوں آنے دیا، واپس کیوں نہیں کیا؟ یہ ان سے پوچھنا چاہئے، اور کیا آپ ہر مسلمان کے گھر جا کر دیکھیں گے کہ کیا پکایا ہے؟ آپ تو حکومت سے پوچھیں کہ کس کی اجازت سے ایسا ہو رہا ہے اور حکومت کیوں قابو نہیں پاتی ان چیزوں پر؟ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جو لوگ قابل قدر ہیں آپ ان سے لڑنے چلے آئے۔ آپ سب فوراً اپنے وارڈ میں چلے جائیں اور کسی طرح کے دنگے جھگڑے میں ساتھ نہ دیں۔ یہ

سن کر آر ایس ایس کے تمام لوگ اپنے اپنے وراڈ کو جانے لگے۔ یہ دیکھ کر جن سنگھ کے وابستگان اور سوشلسٹ بھی جانے لگے۔ بالآخر criminals نے یہ دیکھ کر کہ اب ہم اکیلے پڑ جائیں گے، سیاسی قیدیوں میں اب کوئی ساتھ دینے والا نہیں، واپس چلے گئے اور بعد میں آکر ڈاکٹر صاحب سے اپنی شرمندگی کا اظہار کرنے لگے کہ پولیس والوں کے بہکانے میں وہ آگئے تھے انہیں معاف فرمائیں۔

جب ہماری ضمانت ہوئی اور ہم رہا ہو کر آنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں نصیحت کی کہ اپنے ساتھیوں اور ان کے گھر والوں کی خبر گیری کریں اور حالات سے انہیں برابر مطلع کرتے رہیں۔ چناں چہ ہم نے رفقا سے ربط قائم کیا، جو جیل میں تھے ان کے گھر والوں کے احوال معلوم کئے اور ان کے مسائل کو ممکن حد تک حل کرنے کی کوشش کی۔ وقتاً فوقتاً ڈاکٹر صاحب کو حالات سے آگاہ کرتے رہے اور وہ برابر مشوروں سے نوازتے رہے اور ہر وقت ہدایات دیتے رہے۔ ہر ایک رفیق کے لیے برابر فکرمندی کا اظہار کرتے رہے۔ سب کے مسائل کو حل کرنے کی طرف متوجہ اور دعا گو رہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب کی ضمانت ہوگئی ہے تو مجھے ہدایت کی کہ دہلی جا کر ان سے ملاقات کروں اور ان کی ہدایت حاصل کروں اور اس کے مطابق عمل کروں۔ ڈاکٹر صاحب جس طرح جیل سے باہر اپنے گھر میں بیٹھے رفقا کی تربیت اور ان کی ہر قسم کے مسائل کو حل کرنے کی طرف متوجہ اور فکرمند رہا کرتے تھے بالکل اسی طرح جیل میں بھی رہے۔ ایسا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ جیل میں ہیں۔ لوگ اکثر پابندی کا رونا روتے اور اس کی مذمت کرتے تو ڈاکٹر صاحب مسکراتے اور فرماتے: ہمارے دل و دماغ پر تو پابندی نہیں ہے، کوئی چاہے تو بھی کیسے لگا سکتا ہے! رہا ہمارا جسم، تو اسے اللہ جہاں چاہے جس حال میں رکھے ہمیں اسی کی فکر زیادہ نہیں کرنی چاہئے۔ ہماری شناخت تو ہمارے فکر و خیال سے ہے، عقیدے اور عمل سے ہے، اس پر کہاں پابندی ہے؟ ہم جہاں ہیں اس لحاظ سے مکلف بھی ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

پاٹھک جی پھلواری شریف کیمپ جیل کے اسسٹنٹ جیلر تھے اور جیل کے عملوں میں وہ

سب سے زیادہ ہم لوگوں سے قریب ہو گئے تھے۔ لٹریچر بھی اچھا خاصہ مطالعہ کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن میں پابندی سے شرکت کی کوشش کرتے تھے۔ جب پابندی اٹھی اور ڈاکٹر صاحب رہا ہونے لگے تو وہ آنکھوں میں آنسو لیے کھڑے تھے۔ کہنے لگے کہ اس کی خوشی ہے کہ آپ جیسے آدمی کو رہائی ہوئی لیکن غم ہے کہ آپ جیسا ساتھی چھوٹ رہا ہے! بڑے سیاسی قیدی چھوٹ کر گئے اور جا رہے ہیں۔ نئی سرکار چاہے گی تو یہی لوگ حاکم بنیں گے لیکن ہمارے دل و دماغ پر تو حکومت ڈاکٹر صاحب کی ہی رہے گی۔ بڑی حسرت اور محبت و عقیدت سے سب نے اس سراپا خیر اور صاحب عزیمت ہستی کو رخصت کیا۔

مجرم نہیں کسی کا میں اللہ کے سوا

□ عبدالشکور
نارسنگھ استھان، ضلع ہزاری باغ (جھارکھنڈ)

جون ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی لگی تو جماعت کے دارالمطالعہ اور آفس کو بند کر دینا پڑا۔ حافظ محمد مستقیم (رکن جماعت) کو D.I.R. کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ مجھے بھی ڈھونڈا گیا مگر میں اُن دنوں رخصت پر تھا، جماعت کے ایک ہمدرد افتخار عالم کو D.I.R. کے تحت گرفتار کیا گیا۔

پولیس نے ۲۰ رجولائی ۱۹۷۵ء کی رات کو دو بجے میرے کوارٹر پر چھاپہ مارا اور میسا کے تحت گرفتار کرلیا۔ بھر کنڈہ سے جناب محمد اسماعیل صاحب، چتر پور سے مولانا حبیب اللہ صاحب، احمد حسن صاحب اور شہود الحق صاحب بھی گرفتار کیے گئے۔ دن بھر بھو کے پیاسے رکھے گئے اور شام کو پولیس کی نگرانی میں ہوٹل لائے گئے، اور کہا گیا کہ اپنے پیسے سے جو کھانا ہے کھالو۔ ۳ بجے شب میں ہمیں ہزاری باغ سنٹرل جیل میں داخل کیا گیا۔

جیل پہنچنے سے قبل میں نے اپنے بڑے صاحبزادے کو وصیت کی کہ صبر سے کام لو، اللہ تعالیٰ خیر کرے گا۔

جب جیل میں آیا تو ایک دن مولانا حبیب اللہ صاحب چتر پوری نے مجھے اپنے پاس بلایا، قریب بٹھا کر پوچھا کہ ”عبدالشکور صاحب! اللہ کی رضا کا کیا مطلب ہے؟“ میں نے جواب دیا کہ اللہ کی نافرمانیوں سے بچے رہنا اور حتی المقدور اُس کے حکموں پر چلنا۔ مولانا نے کہا کہ ”اتنی بات اور اُس میں جوڑ لیں کہ ایک چیز آپ کے پسند کی تھی وہ نہ ہوئی اور اللہ

تعالیٰ جو پسند کرتا ہے وہ ہوا اور ہو رہا ہے، آپ اللہ کی پسند کو اپنی پسند بنالیں اور اسی پر راضی رہیں، اللہ تعالیٰ آپ کا اور آپ کے بچوں کا پروردگار اور نگہبان ہے۔'' میں اُن کی باتوں کو غور سے سُن رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مولانا نے تفصیل سے میرے نجی معاملات کا حال معلوم کیا اور اسی کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ایک نظم لکھی اور رات میں بعد از طعام وہ نظم ترنم کے ساتھ پڑھنے کے لیے مجھے دی۔ مولانا ایک اچھے شاعر بھی تھے۔

جس وارڈ میں ہم تمام لوگ تھے وہ اسٹیٹ وارڈ State Ward کہلاتا تھا۔ ۸۵/ بیڈ پر لوگ موجود تھے، جس میں آر۔ایس۔ایس، کمیونسٹ، آنند مارگ اور جے پرکاش تحریک کے لوگ تھے، اس کے علاوہ کچھ سزا یافتہ کرمنل Criminal لوگ بھی تھے۔ وہ نظم جسے مولانا نے مجھے پڑھنے کو دی درج ذیل ہے۔ تمام لوگ بڑے انہماک اور دلچسپی سے سُن رہے تھے اور رو بھی رہے تھے:

رہ رہ کے آرہی ہے یہاں جو بھی گھر کی یاد — سلمیٰ رُلا رہی ہے تری چشم تر کی یاد
آنے کے وقت سویا تھا بچہ جو بے خبر — تڑپا رہی ہے مجھ کو اُسی بے خبر کی یاد
بچوں کی ضد وہ بیوی کا غم ماں کی مامتا — دل ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے وقت سفر کی یاد
وہ میٹھے میٹھے بول وہ سو جانا گود میں — کیسے بھلائی جائے گی لخت جگر کی یاد
منّی تڑپ کے رہ گئی بسکٹ کو پھینک کر — اب بھولتی نہیں اُسی جانِ پدر کی یاد
جس رہگزر پہ ملتے تھے احباب جا بجا — آتی ہے میرے دل میں اُسی رہگزر کی یاد
سلمیٰ مری خدا کے لیے اس طرح نہ رو — مجھ کو رُلا رہی ہے تری چشم تر کی یاد
تم مجھ کو بھول جاؤ یہی ہے مری صلاح — کیا فائدہ کہ ہو کسی آشفتہ سر کی یاد
میری رفیقہ دل سے بھلا ماسوا کی یاد — مشکل میں کام آتی ہے رب بشر کی یاد
آنچل خدا کے سامنے پھیلا کے مانگ لو — تسکین دے گی مالکِ خیرالبشر کی یاد
روتی جو یوں رہو گی تو رونے سے فائدہ — ہلکان کر نہ دے تمہیں شام وسحر کی یاد
بچوں کو تھپ تھپا کے سُلا آنسوؤں کو پوچھ — بے چین کر نہ دے اُنہیں اپنے پدر کی یاد
روٹی بھگو لو پانی میں جب اور کچھ نہ ہو — بچوں کو مضطرب نہ کرے نانِ تر کی یاد

روٹھیں جو ننھے منوں کو روتا نہ چھوڑنا ہوتی ہے فکر اسی کی جب آتی ہے گھر کی یاد
اُٹھتی ہے دل میں ہوک سی کیوں ہم نشیں نہ پوچھ بیتاب کر رہی ہے اِدھر کی اُدھر کی یاد
رہتے ہیں ننھے بچے مرے جس مکان میں آتی ہے دوستو! اُسی دیوار و در کی یاد
بچوں کی یاد آئے تو فطرت سلیم ہے اللہ کا ہے شکر نہیں سیم و زر کی یاد
دو اک گھڑی کی یاد تو خیر ایک بات ہے کر دے کہیں نڈھال نہ دو دو پہر کی یاد
آنسو سے دل کی آگ بجھا لو کبھی کبھی ایسا نہ ہو ڈبو دے یہ شام و سحر کی یاد
یا رب کچھ اپنی یاد کی توفیق دے مجھے کب تک رہے گی دل میں اِدھر کی اُدھر کی یاد
دل کا قرار یاد خدا میں ہے دوستو! اب ختم بھی کرو یہ اِدھر کی اُدھر کی یاد
اے محوؔ ناامید نہ ہو مضطرب نہ ہو تسکین دینے والی ہے رب بشر کی یاد
مجرم نہیں کسی کا میں اللہ کے سوا بے بس ہوں میرے پاس نہیں آہ کے سوا

مولانا کے تمام اشعار اگر نوٹ کروں تو ایک کتاب بن جائے، مسلسل گیارہ مہینہ جیل میں ساتھ رہنا ہوا۔ ناچیز کو بہت چاہتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ نے زندگی دی اور جیل سے باہر ہوئے تو سیرت رسولؐ پر تقریر کروں گا اور آپ کو نعت رسولؐ پڑھنے کے لیے ساتھ رکھوں گا۔ جب کبھی بھی شعر مجھ کو بٹھا کر میری زبان سے ترنم کے ساتھ سنتے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ جس وقت رات کے سناٹے میں یہ غزل نما نظم پڑھی جا رہی تھی جیل کی پولیس بھی باہر کھڑکی میں کان لگائے سن رہی تھی، وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے "کیسے کیسے بے قصوروں کو حکومت نے جیل میں بند کر دیا ہے"۔ دیوگھر کے ایک پنڈا جی بھی اُسی وارڈ میں تھے، جھا جی کے نام سے مشہور تھے، لحیم شحیم اور جٹا دھاری، بے حد متاثر ہوئے اور مجھے گرو جی کہنے لگے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں شاعر نہیں ہوں میرے استاد مولانا محترم ہیں جن کا لکھا ہوا میں پڑھتا ہوں۔

ہم ارکان جماعت اُس وارڈ میں ۹ کی تعداد میں تھے، کچھ وکلا بھی تھے، جماعت سے نماز پڑھی جاتی، میں اذان دیتا۔ قاری نظیر احمد صاحب (چائے باسا) نماز پڑھاتے تھے اور مولانا حبیب اللہ صاحب محوؔ ہم آٹھوں ارکان کو فارسی کی تعلیم دیتے تھے اور قرآن

کی تفسیر بیان کرتے تھے، یہ عمل ایک روٹین کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ ہر ہفتہ جیل کے سارے میسا بندی ایک جگہ جمع ہوتے اور پروگرام چلتا، تقریریں ہوتیں، اُترّی بہار کے لوگ اشعار پڑھتے لیکن مولانا اپنی علالت کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہوتے بلکہ اپنے اشعار میرے حوالہ کر دیتے اور محفل میں پڑھنے کی تاکید فرماتے۔ ۲۳۵ میسا بندی تھے جو مختلف پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جیل کی انتظامیہ بھی اچھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ ایک محفل میں جہاں سارے میسا بندی اور انتظامیہ کے لوگ موجود تھے، مولانا کے اشعار پڑھنے کا اصرار ہوا۔ جو اشعار میں نے پڑھے وہ اس طرح تھے:

مُلا نے کہا جب مُرغے کی اک ران نہیں تو کچھ بھی نہیں — پنڈت نے کہا اے ججما نو پکوان نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہم نے جو کہا مسلم کے لیے قرآن نہیں تو کچھ بھی نہیں — وہ بولے لیکن 'اندرا' کا فرمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
قدرت کے عجائب خانے میں آنکھوں سے دیکھنے والوں میں — مدہوش بھی ہیں ہوشیار بھی ہیں حیران نہیں تو کچھ بھی نہیں
اک بات کا دعویٰ تم نے کیا اک بات کا دعویٰ ہم نے کیا — دعوے تو بہت ہو سکتے ہیں پر مان نہیں تو کچھ بھی نہیں
کچھ اچھی باتیں تم میں ہیں کچھ اچھی باتیں ہم میں ہیں — اچھی باتیں اچھی ہیں مگر ایمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہونے کو تو یوں ہم سب کچھ ہیں، ذی علم بھی ہیں ودوان بھی ہیں — مولانا بھی، آچاریہ بھی ہیں انسان نہیں تو کچھ بھی نہیں
اک صف میں ظالم سارے ہیں اک صف میں دُکھ کے مارے ہیں — ان دونوں میں رن جاری ہے گھمسان نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہندو مسلم، سکھ عیسائی کہنے کو تو ہیں بھائی بھائی — بھائی بھائی ایک دوسرے پر قربان نہیں تو کچھ بھی نہیں
سب ہندو ایک نہیں ہوتے سب مسلم نیک نہیں ہوتے — گر اچھے برے کی ہم سب کو پہچان نہیں تو کچھ بھی نہیں
شکچھا بھی سہی روٹی بھی سہی رہنے کے لیے کوٹھی بھی سہی — اک متر نے اچھی بات کہی بھگوان نہیں تو کچھ بھی نہیں
گنگا اشنان اگر چاہیں اک بار نہیں سو بار کریں — دکھیوں کی یاد میں اشکوں سے اشنان نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہم پر تو لگا دی پابندی، خود جیت کے گیت لگی گانے — پلیئر بھی ہے صاحب گیند بھی ہے میدان نہیں تو کچھ بھی نہیں
بُڈّھی کا مہتو آوشیک ہے اب اس میں کسی کو کیا شک ہے — اے محوؔ! اگر اس دنیا میں بلوان نہیں تو کچھ بھی نہیں

جب مندرجہ بالا اشعار پڑھے جا رہے تھے تو بار بار نعرے لگتے تھے۔ جیلر ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتا تھا کہ گرو جی! اب بند کیجیے، اس پر سب نے نعرے لگائے: کتنی لمبی جیل تمہاری، دیکھ لیا ہے دیکھیں گے۔ وغیرہ وغیرہ

اسی طرح دِن گزرتے رہے۔ لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جیل کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا جو بھلائے نہ بھلایا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ مظفر پور کے دو کرمنل (Criminal) جو میسا کے تحت گرفتار ہو کر آئے تھے، انہیں وہ ڈائٹ (غذا) نہیں ملتی تھی جو میسا بندیوں کو دی جاتی تھی۔ وہ لوگ تھے بھی دوسرے وارڈ میں۔ انھوں نے بھوک ہڑتال کر دی تو انتظامیہ نے ان کا تمام راشن ضبط کر لیا اور اُن سے کہا کہ جاؤ جب تک تمہارا جی چاہے ہڑتال کرو، تمہاری ہڑتال سے کچھ بگڑے گا نہیں۔ یہ سن کر وہ غضبناک ہو گئے اور جیل کے اندر ہی ایک ۲۰ رفٹ کا چوڑا کنواں تھا اُس میں ان لوگوں نے چھلانگ لگا دی۔ اتنا چوڑا کہ تین طرف سے وارڈوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ جو حصہ ہماری طرف تھا اُسی طرف وہ تیر کر آ گئے اور دہائی دینے لگے۔ جئے پرکاش تحریک کے جوانوں نے شور مچایا۔ چیف وارڈن اُسی وارڈ کی طرف آ کر اُن لوگوں کو منا رہا تھا کہ ایک جوان نے چیف وارڈن کی سیٹی چھیننی چاہی۔ اسی کو دیکھ کر جیل کی دیوار پر بنی گمٹی کے سپاہی کو ایسا محسوس ہوا کہ چیف وارڈن کو پیٹا جا رہا ہے۔ اُس نے فوراً پگلی گھنٹی بجائی اور پورے جیل میں قیامت برپا ہو گئی۔ چاروں طرف سے سزا یافتہ قیدی لاٹھی لے کر دوڑے اور جس کو جہاں پایا وہیں مار کر گرانے لگے۔ ان لوگوں کے پیچھے سے ہی پولیس بھی بندوقیں لے کر پہنچی اور بندوق کے کندے سے قیدیوں کی پٹائی شروع کر دی۔ اسی اثناء میں بے چارے جعفری وکیل صاحب جو غسل کر رہے تھے انہیں اس طرح مارا پیٹا گیا کہ اُن کا انگوٹھا ٹوٹ گیا۔ متعدد قیدیوں کے ہاتھ پیر توڑ ڈالے گئے۔ مولانا حبیب اللہ صاحب کے بستر کے پیر کی جانب محترم محمد اسماعیل صاحب بیٹھے ہوئے تھے، اس طرف قیدی داخل ہوئے اور اندھا دُھند لاٹھی چلانے لگے۔ ہم لوگ مار کھا رہے تھے اور بچاؤ کی تدبیر میں تھے کہ ایک بدمعاش وہاں اچانک وارد ہوا اور اُس نے مولانا کو ایک زوردار لاٹھی ماری۔ مولانا نے کراہتے ہوئے یا اللہ کہا اور لیٹے ہی رہ گئے، چوٹ زبردست تھی۔ جب ہنگامہ ختم ہوا تو جیلر اور جیل کے دوسرے ذمہ دار مولانا سے معافی مانگنے لگے۔ مولانا تو علیل پہلے سے تھے ہی، اس چوٹ نے اُنہیں اور بھی بیمار کر دیا۔ یہاں تک کہ پیرول پر ان کی رہائی ہو گئی اور انہیں بغرض علاج رانچی راجندر میڈیکل کالج لایا

گیا۔ وہاں ان کا علاج ہوا لیکن ۱۲ دنوں کے بعد تکلیف کی شدت کو برداشت نہ کر سکے اور ہمیشہ کے لیے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ''انا للہ وانا الیہ راجعون''۔ جب ان کی وفات کی خبر جیل میں آئی تو تمام جیل کے افراد غم میں ڈوب گئے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

مجھے جب جیل میں مولانا کی وفات کی خبر ملی تو میرے اوپر غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جہاں تک یاد ہے میں اپنے والد کے انتقال پر بھی اس قدر ملول نہ ہوا تھا جس قدر اس خبر نے مجھے ملول کیا۔ جس نے ''لا یکلف اللہ'' کا درس دیا تھا، جس نے اس کا مفہوم اور مطلب سمجھایا تھا اور ہمارے تمام قسم کے غم واندوہ کو غلط کیا تھا، جس کی تلقین اور نصیحت سے میں جیل میں خوش اور مطمئن تھا، جس کے قول پر اپنے اہل وعیال کو اللہ کے سپرد کر چکا تھا، وہ ہستی ہم سے دور چلی گئی تھی۔ ان کی وہ بات یاد آنے لگی کہ بشرطِ حیات جیل سے رہائی پر میں سیرت رسولؐ پر تقریر کروں گا اور آپ کو نعت رسولؐ کے لیے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ بہر کیف مولانا کی یہ نصیحت یاد آئی کہ اللہ جو چاہتا ہے اس پر تم بھی راضی ہو جاؤ، یہی اللہ کی رضا ہے۔ مولانا مرحوم ومغفور چترپور کے لیے ایک بنیان تھے، اُن کی وفات سے وہاں کی تحریکی بنیان ہی کمزور ہو گئی، وہ خلاء جو اُن کی وفات سے تحریک اسلامی میں ہوا وہ پُر نہ ہو سکا۔ مولانا مرحوم کے اوصاف مجھ جیسا بے بضاعت انسان نہیں بیان کر سکتا مگر مختصراً کچھ باتیں رکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

مولانا حبیب اللہ صاحب کو گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن لایا گیا تو پولیس اسٹاف ان کو بند کرنے کے لیے لاک اپ کے پاس لے گیا۔ مولانا نے دیکھا کہ لاک اپ میں ایک دس گیارہ سال کا معصوم بچہ قید ہے، وہیں ایک کتا بھی بیٹھا ہے اور لاک اپ میں انتہائی گندگی ہے۔ مولانا نے حیرت کے ساتھ کہا کہ کیا اس میں ہمیں بند کرو گے؟ پولیس والے نے خفگی کے ساتھ کہا کہ نہیں تو کیا محل میں بند کریں گے! اور وہ لاک اپ کا تالا کھولنے لگا۔ مولانا نے فرمایا کہ ان شاء اللہ تالا نہیں کھلے گا۔ پولیس والے نے بہت کوشش کی لیکن تالا نہیں کھل سکا۔ اس نے جا کر داروغہ سے تالا نہ کھلنے کی بات کہی تو اس نے ایک دوسرے پولیس والے

کو تالا کھولنے کا حکم دیا۔ اس نے بھی ناکام ہو کر داروغہ کو تالا نہ کھلنے کی اطلاع دی تو وہ جھنجلاہٹ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ تالا کیوں نہیں کھل رہا ہے، خود تالا کھولنے کی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ جب وہ بھی کامیاب نہیں ہوا تو پولیس والے نے اس سے آہستہ سے کہا کہ صاحب! ان مولانا نے لاک اپ کی کیفیت دیکھ کر پہلے ہی کہا تھا کہ تالا نہیں کھلے گا۔ داروغہ کو شائد معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی اور مولانا حبیب اللہ صاحب کے سامنے انتہائی شرمندگی اور معذرت خواہانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور فوری طور پر مولانا کے لیے ایک دوسرے کشادہ اور صاف ستھرے کمرے میں سفید چاندنی بچھوا کر بہت ہی شاندار انتظام کیا اور اپنی خیریت کی دعا کی درخواست کرتا رہا۔

صبح فجر کے وقت مولانا نے لاک اپ والے بچے کے سلسلے میں پولیس والے سے معلوم کیا تو اس نے کہا کہ وہ وہیں پر اپنی ضروریات وغیرہ سے فارغ ہو لے گا۔ اس پر مولانا نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ وہ لاک اپ میں ضروریات سے کیسے فارغ ہوگا، اس کو باہر تو نکالیے۔ مولانا کے اصرار اور پولیس والے کا گریز جاری تھا، بالآخر اس نے پریشان ہو کر مولانا سے کہا کہ رات کو ہم لوگوں نے بعد میں بھی تالا کھولنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں کھلا۔ مولانا نے برجستہ فرمایا کہ جایئے کھولیے انشاء اللہ کھل جائے گا۔ چناں چہ پھر پولیس والا داروغہ کو لے کر لاک اپ پہنچا۔ داروغہ نے چابی لگائی ہی تھی کہ تالا کھل گیا۔ داروغہ ہاتھ جوڑے جا کر مولانا کا پیروں میں گر پڑا اور پھر خوف زدہ سا، حد درجہ عقیدت کے ساتھ مولانا سے اپنے لیے خیر کی دعا کرنے کی درخواست کرتا رہا اور مولانا کو غیر معمولی عزت و احترام کے ساتھ جیل پہنچایا تو جیلر سے اپنے انداز میں مولانا کی عظمت و بزرگی کا ذکر کیا اور جیل میں ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی سفارش کی۔

جیل میں اکثر کمیونسٹوں سے اللہ کی ذات اور مذاہب پر مولانا کی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ بحث کرنے والے وکلاء اور دانشور ہوا کرتے تھے جو جنتا پارٹی کے دور میں ایم پی اور ایم ایل اے بنے۔ مولانا متانت اور سنجیدگی سے ان کے سوالوں کا اس طور سے جواب دیتے کہ وہ لاجواب ہو کر رہ جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مولانا ہم لوگ لاجواب تو ہو گئے ہیں مگر وہ دل

کہاں سے لائیں جس سے اللہ پر پختہ ایمان ہوتا ہے۔ آخرت کے متعلق عقل بھی تصدیق کرتی ہے مگر دل ہے کہ قابو میں آنا نہیں چاہتا۔ مولانا مثالوں کے دھنی تھے، مثالوں کے ذریعہ اپنی باتوں کو دلوں میں بٹھا دیتے تھے۔ آپ کی مثال کو کبھی بھی کاٹا نہیں جا سکتا تھا۔ جیل کے تمام افراد آپ کے احترام میں سر جھکا دیتے تھے۔ پورے جیل میں یہ بات مشہور تھی کہ مولانا حقیقتاً بہت ہی قابل اور لائق صد احترام ہیں۔ آر۔ ایس۔ ایس کے لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ مولانا اگر یہی اسلام ہے جس کی خبر آپ دیتے ہیں تو اس اسلام سے ہم کو کوئی بیر اور دشمنی نہیں ہے۔ جھاجی جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں صبح میں پوجا سے پہلے مولانا محترم کو جھک کر پرنام کرتے پھر اپنی پوجا پاٹ میں لگتے تھے۔

مولانا ایک زبردست خطیب تھے۔ آخری تقریر آپ کی جیل میں ہوئی تھی جس کا عنوان تھا، عید کیا ہے؟ اور اس کے کیا تقاضے ہیں؟، اس روز پوری جیل کے اسٹاف، قیدی اور سارے میسا بندی جمع تھے۔ گھنٹہ بھر کا خطاب تھا۔ آپ کی تقریر نے تمام لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ تمام لوگ آپ کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے۔ اُن کی طبیعت میں مزاح بھی تھا، معلم کی حیثیت سے سمجھانے اور بتانے کا انداز ہی جُدا تھا۔ آپ کی مثالوں اور باتوں سے ایک کند ذہن بھی بات کی تہہ تک بآسانی پہنچ جاتا تھا۔ شگفتگی اور نرم مزاجی اللہ نے آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر ودیعت کی تھی۔ ظاہری خوبصورتی سے بھی اللہ نے آپ کو نوازا تھا۔ نام ونمود سے دور بھاگتے تھے، جماعت کے پرانے لوگ تمام ہی آپ سے متعارف ہیں۔ جیل کے اندر جتنے اشعار آپ نے کہے وہ سب ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ جو اشعار آپ نے ''وزیر اعظم سے بھارت کی ناری کی فریاد'' کے عنوان سے کہے تھے وہ پورے بہار میں ایمرجنسی کے بعد کے پارلیمانی الیکشن کے وقت پڑھے گئے تھے۔ کانگریس کی ہار کے بہت سارے اسباب رہے ہوں گے لیکن ہار کا ایک خاص سبب ایمرجنسی کا نفاذ تھا جس کا ذکر مولانا مرحوم نے کیا تھا۔ جیل میں مولانا کے شاگردوں میں راقم الحروف، شہود الحق صاحب، محمد اسرائیل صاحب، مصطفیٰ احسن اور محمد اسماعیل صاحب مرحوم تھے۔ جناب شہود الحق صاحب بھی شاعر ہیں، وہ اپنا تخلص روشن رکھتے ہیں۔ مولانا کے انتقال کے بعد بھی جیل میں محفلیں ہوتی

تھیں مگر وہ کیف باقی نہ تھا۔

پارلیمنٹ کے انتخاب میں کانگریس پارٹی ہار گئی۔ ظلم کی سیاہ رات کا خاتمہ ہوا، جماعت اسلامی ہند بحال ہوئی۔ جنتا سرکار بنی، مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم بنائے گئے۔ وطن عزیز کو آمریت سے نجات ملی۔ خدا کرے ایسی سیاہ رات پھر کبھی نہ آئے۔

رابطے قائم رہے

❑ عبدالرزاق شبنم
غریب پور، ضلع بانکا (بہار)

ایمرجنسی کے اعلان کے دوسرے دن درس گاہ اسلامی تاتار پور (بھاگلپور) بہار میں میری گرفتاری عمل میں آئی۔ مجھے گرفتار کر کے تھانہ کوتوالی بھاگلپور پہنچا دیا گیا۔ بعدازاں میں سنٹرل جیل بھاگلپور میں تقریباً اکیس ماہ سے زیادہ رہا۔ باہر نکلا تو ایسا لگا گویا اندھیرا ختم ہو چکا ہے اور سویرا ہو گیا ہے۔ ایک بار پھر ملک نے سکون واطمینان کا سانس لیا۔

۱۔ جیل کے اندر بہت زیادہ ٹھوس اور مستحکم کام کا موقع ملا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کی اجازت سے میسا وارڈ میں اردو کلاس کا آغاز ہوا، جہاں نوجوانوں کے علاوہ کچھ معمر سیاست داں حضرات نے بھی اردو سیکھی۔ آر۔ایس۔ایس کے ۳۳ نوجوان کتاب پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔ تقریباً ۷۵ افراد نے استفادہ کیا۔

۲۔ ایک بار میسا کے نظر بندوں اور سپریٹنڈنٹ جیل کے درمیان تناؤ پیدا ہو گیا۔ نوبت پولیس ایکشن کے قریب پہنچی۔ دو غیر مسلم لیڈروں سے مل کر میں نے جیل کو اس تناؤ سے نکالنے کی کوشش کی۔ امن وامان کی اس کوشش سے جیل کے ذمہ دار اور گرفتار شدگان دونوں خوش ہوئے۔

۳۔ جیل کے اندر چھاتر سنگھرش سمیتی اور آر۔ایس۔ایس کے جوانوں کے درمیان تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس کے لیے بھی دو دن تک کوشش جاری رہی۔

۴۔ باہمی میل محبت اور خیر سگالی کے لیے حکام کی اجازت سے نو افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا کنوینر راقم کو منتخب کیا گیا۔

رمضان المبارک کے روزوں کا وہ لطف جو باہر کبھی حاصل نہیں ہوا تھا یہاں حاصل ہوا۔ نماز، تلاوت قرآن پاک اور کارِ دعوت کا اچھا خاصا موقع ملا اور آخر تک تسلی بخش روابط رہے جو رہائی کے بعد بھی قائم رہے۔

امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحب کا مکتوب وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے نام

Jamaat Chief Letter To Mrs. Gandhi From Jail

In the Name of Allah, the Beneficent, the Merciful

Sangeen Barrack
Central Jail
Tehar
26-7-75

Mrs. Indira Gandhi
Prime Minister
New Delhi
Through
The Superintendent
Central Jail
Tehar, New Delhi

Madam,

Greetings!

I am sorry to learn, while in jail, that the Jamaat-e-Islami Hind has also, been banned along with some other organizations. Although I do not know the reasons for banning the Jamaat, I learnt from the resolution of the Congress Working Committee through the Indian Express of the 15th instant that the emergency provision have been invoked to forestall the subversive attempts of some opposition parties and groups which had drawn up plans to 'strike at strategic points paralyse the life of the nation'. Presumably it is in this context that the Jamaat-e-Islami Hind has also been banned.

I state categorically that the Jamaat-e-Islami Hind has neither planned, nor attempted to commit, nor committed, nor aided in nor abetted any of the things mentioned in the Resolution. Moreover, we had never had any connection whatsoever with any opposition party or with any other banned organizations or with any other group hinted at in the Resolution, nor have we ever indulged in any illegal, unlawful or unconstitutional activity.

On the other hand, we have consistently and vigorously propagated against violence of all type. If I had access to the records of the Jamaat, I would produce before you ample material in this respect including my printed speech in English delivered at Ahmedabad in a gathering presided over by Mr. Shriman Narayan, the Governor of Gujarat, following the Ahmedabad riot. I vividly remember having quoted passages from the Qur'an to show how Allah dislikes violence, chaos, anarchy or things that disrupt a community's life.

In fact the Jamaat has for some years past felt highly perturbed and concerned at the uneasy political situation fastly developing in our country. The mounting trends of lawlessness, anarchy and discord pained us deeply. Accordingly, as far back as 1972 the Jamaat's Central Advisory Council (which was a duly elected body) gave its anxious thought to the prevailing situation and through a comprehensive resolution appealed to eschew violence and lawlessness, etc. and decided that our organization would do its utmost to dissuade or countrymen from following a suicidal course. Our branches all over India since then tried their best to implement this Resolution.

Again in my presidential address delivered at the 5th All-India Conference of the Jamaat held in Delhi in November, 1974, I struck a clear note of warning on this subject and frankly criticized the course of action adopted by some leaders. I also expressed my strong disapproval at the call given to students to abandon their educational institutions and to plunge in the struggle for paralyzing the

administration. You must have certainly read about it as it was widely reported in the press and by the All India Radio.

This unequivocally establishes that the Jamaat strongly disapproved those methods of agitational protests which lead to lawlessness, anarchy or disorder etc. In fact we expressed our disapproval of strikes, lock-outs, hartals, fasts unto death, dharnas and things of that sort. Although we had had fully sympathy with the cause of the Aligarh Muslim University, we openly dissociated ourselves from all such programmes involving dharnas, etc. These are also reported in the press. The above mentioned attitude was wholly in accordance with the methodology, policy and programmes of the Jamaat. The Constitution of the Jamaat was based on the salutary teachings of Islam. It specifically laid down that in all its actions the Jamaat would be bound by moral limits and never adopt such means or ways which are against truth and honesty or through which may come about communal hatred, class-struggle, social chaos, discord, anarchy, corruption or mischief in the land. It further provided that for the achievement of its objectives, the Jamaat would adopt constructive and peaceful methods. It is also categorically stated in the printed policy of the Jamaat that it 'adopts moral, constructive, peaceful democratic and constitutional methods'. That we adhered to the letter and the spirit of our Construction and policy is borne out by the conduct of the Jamaat during the whole tenure of its existence.

The Jamaat's literature and newspaper reports bear ample testimony to the above. Hence the action taken by your Government against the Jamaat and its members will surely come as a painful surprise to all our countrymen, Muslims and non-Muslims, who know the Jamaat well. It will also appear as odd to the people of those countries from where delegates had come to participate in our Conference who appreciated the policy, programme and modus vivendi of the Jamaat as also the freedom of expression and association enjoyed by our countrymen. Their appreciation was

reported in the local as well as in the foreign press.

I am afraid that the ban on the Jamaat and arrests of its office bearers and members throughout the country on false charges might tarnish the image of India abroad. People there might think that Muslims of India do not enjoy the freedom to lifting humanity spiritually, morally and materially—as enjoined in the Qur'an and the traditions of the Prophet (peace be upon him) for the Jamaat is known in the outside world as an organization wholly dedicated to the cause of Islam and working for the realization of Islamic ideals such as Godliness, righteousness, liberty, equality, fraternity, and social justice, compassion, love, and interest-free just economic order, a democratic political system based on Divine Sovereignty, etc.

The frivolous nature of the charges against us will be abundantly clear to you from perusal of the file of my case and that of my colleague, Maulana Syed Hamid Ali, the court of Shri A.K. Patandy, S.D.M. Daryaganj, Delhi....

Surprisingly this charge has been leveled against us despite the well-known fact that the Jamaat-e-Islami Hind was neither a rival to, nor in truck with, any political party nor it had ever taken part in parliamentary politics unlike the Jamaat-e-Islami of Jammu & Kashmir which by the way, is a separate entity altogether.

We had in fact felt grieved at the increasing confrontation between the Ruling Party and the Opposition since it was retarding the progress of our country. We had therefore, been advising both to develop an atmosphere of mutual trust, understanding and cooperation and to work together in a spirit of coordination which would ultimately be in the best interest of the parties concerned and the nation as a whole.

In keeping with the above I issued on June 27, a directive to the members of the Jamaat through the Urdu Daily Dawat to call the people towards rectitude and righteousness and to persuade the people to desist form indulging in lawlessness and anarchy. Again on

June 28, the day of my arrest, I had issued a statement published in the Daily Dawat in which I appealed to our countrymen to maintain peace at all costs, to avoid all such acts which may create disorder and chaos and warned them that conditions of lawlessness and anarchy are at all events harmful to the country.

Now when the new situation due to the declaration of emergency arose, I, in my capacity as the head of an all-India organization which had the good of the country at heart, felt it my bounden duty to summon the then members of the Central Advisory Council of the Jamaat to consider how best we could play our role within the framework of law in the new situation and how could the country be saved from the likely eruption of lawlessness and disorder. Accordingly I held a meeting of as many members of the Central Advisory Council as could gather by the 28th June. The Council approved the directive and the statement issued by me on the 27th and 28th June referred at about 11:30 A.M. on the 28th June to be resumed at 3:30 P.M. for deliberations about further steps to be taken in the light of the said directive and the statement but before we could reassemble two of my colleagues and myself were arrested at about 2:15 P.M.

I wish to stress that the Jamaat was mainly concerned with an all-round and comprehensive religious, social and moral reform and uplift of society and it had nothing to do with parliamentary politics. However, it did want that the whole life of man including his political activities should be guided and governed by those moral and spiritual principles which were practised and propagated by all prophets of the world who did appear in different communities throughout the ages. A comprehensive description of the viable basic principles, practised and propagated by all prophets of the world, and the God-ordained way of life that the individual, society and the State should lead is given in the Qur'an and the Traditions of the Prophet. It is our firm conviction supported by facts of world history that a progressive welfare State, in the true sense of the word, can be

raised only on those principles which are to be found in the Qur'an and the life of the Prophet, Muhammad (peace be upon him)!

The Jamaat strove to adhere to these principles as far as practicable. Its activities were not confined to any particular community, but it worked to promote the spiritual and moral welfare and reform of non-Muslims as well as Muslims together with their material well-being. It aimed at eradicating social evils, communal canker, casteism and untouchability, etc. form the life of our countrymen, while the Jamaat members tried to live the life of righteous, God-fearing and law-abiding citizens.

Our programme also included social service of various kinds and we had been rendering aid to the tune of lacks of rupees without distinction of caste and creed to the victims of natural calamities such as floods, droughts, fires, etc. and to the sufferers of communal riots. We were also running free and subsidised medical dispensaries and also advanced interest-free loans to the needy on the security of ornaments, etc.

The Jamaat was also not unmindful of the vast economic problems.... In my presidential address referred to above I expressed the hope that the Islamic Development Bank which is to advance interest-free loans to Muslim countries would extend its benefits to neighbouring countries not having Muslim majority. That I meant our own country by this is quite obvious.

At the time of the oil crisis we telegraphically appealed to the late King Faisal of Saudi Arabia to retain the oil supply to India and also took a deputation to the Saudi Embassy and the Arab League Mission in Delhi. The response was encouraging.

As a matter of fact we were regularly giving our thoughts to the welfare and development of our country and offered you such suggestions as in our estimation were beneficial to our country. One such constructive suggestion was contained in my letter dated 30-03-75 addressed to you in reply to which I was informed through letter dated 21-04-75 that the 'positive suggestions' made by me were

noted for further study in the Ministry of External Affairs.

I may odd that according to the Constitution of the Jamaat, which was based on the Qur'an and the Traditions of the Prophet, we were bound to desist from all communal, subversive and clandestine activities. The 28-year old record of the Jamaat stands a glorious testimony to this fact. Not only Muslims but many non-Muslims too acknowledge this fact about the Jamaat and did actively cooperate with its humanitarian and welfare activities.

Madam, I have narrated in brief what the Jamaat-e-Islami Hind stood for and what it avoided. Whatever we did, we did quite openly and published it for the information of all. I am afraid you had not had an opportunity to go through our published material and have been supplied with baseless and partisan reports. If you think that some further clarification is required, I shall be too happy to offer it.

In the end I may state that this letter is not in the nature of an apology either on my behalf or on behalf of the Jamaat under ban. It is a simple narration of facts and I hope that in the light of the above you will take a fresh look at the case of the Jamaat-e-Islami Hind since there is no justification for canning it or for keeping its members in detentions.

Thanking you!

Yours sincerely

Sd/-

(MUHAMMAD YUSUF)

President

Jamaat-e-Islami Hind

(now banned)